اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

شریف کنجاہی: شخصیت اور فن

زاہد حسن

پاکستانی ادب کے معمار

شریف کنجاهی
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

شریف کنجاہی
شخصیت اور فن

زاہد حسن

اکادمی ادبیات پاکستان

نگران اعلیٰ : افتخار عارف
منتظم : محمد انور خان
تدوین وطباعت : سعیدہ درانی
اشاعت : 2006
تعداد : 500
ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع : پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت : پیپر بیک:-/130 روپے
مجلد:-/140 روپے

ISBN 969-472-183-0

New ISBN 978-969-472-183-5

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990ء میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں "پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معماران ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ اکادمی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں تعارفی نوعیت کی کتابیں شائع کرنا چاہتی ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ان کتابوں کی ضخامت، معیار اور مندرجات یکساں ہوں۔

شریف کنجاہی، شاعر ہیں، محقق ہیں، مترجم ہیں اسکالر ہیں استاد ہیں اور ایسی ہمہ جہت شخصیت کہ جن کی ساری زندگی جہانِ فکر و دانش کے در و بام تعمیر کرتے، سجاتے گزری اور گزر رہی ہے۔

پیش نظر کتاب ملک کے معروف ادیب اور شاعر جناب زاہد حسن نے بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ شریف کنجاہی کی زندگی اور ادبی خدمات کے حوالے سے تحریر کی ہے۔ زاہد حسن کی یہ کتاب شریف کنجاہی کی شخصیت اور فن کے بعض اہم گوشوں سے متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ "پاکستانی ادب کے معمار" ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

شریف کنجاہی صاحب' واحد ادبی شخصیت ہیں جن پر بات کرنے کے لئے تمہیدی کلمات کی ضرورت نہیں پڑتی' یا کم از کم میں ایسا سمجھتا ہوں- میری اس بات سے مراد یہ ہے کہ آپ بات شروع کر سکتے ہیں- ان کے تخلیقی کام کے حوالے سے' ان کی شاعری کے حوالے سے' نثر کے حوالے سے' تنقید و تحقیق کے حوالے سے اور ترجمہ کے حوالے سے-

ایک ہی شخصیت میں اتنے پہلوؤں' اتنی جہتوں' اتنی وسعتوں کا ہونا اس امر پر صاد ہے کہ کنجاہی صاحب ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک ادارے' ایک درس گاہ کے بارے میں کہنے کے لئے لازم ہے کہ بندہ اس کی تاریخ' تہذیب' جغرافیے اور تمام تر شعبہ ہائے زندگی سے کماحقہ واقفیت رکھتا ہو-

شریف کنجاہی صاحب کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے میں بھی کچھ ایسے ہی معاملات سے دوچار ہوں- اگرچہ ایک ایسی ادبی شخصیت کے بارے میں بات کرنے میں کسی قسم کی دشواری ہونا نہیں چاہئے کہ جس کا ادبی کام' اس کی مصروفیات' اہم ادیبوں/ شاعروں/ دانشوروں کے ساتھ خط وکتابت' ان کے بارے میں مضامین اور گفتگوؤں کا ایک طویل سلسلہ آپ کے سامنے ہو- اور ایک سطح پر یہی بہت کچھ ہونا بھی "نہ ہونا" ہو کر رہ جاتا ہے اور جب اس میں سے بھی بہت کچھ' کچھ نہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہو تو آپ کیا کر سکتے ہیں-

پھر بھی علی عباس جلالپوری' ڈاکٹر اسلم فرخی' شفقت تنویر مرزا' منو بھائی' مظفر علی سید' ڈاکٹر اسلم رانا' خالد ہمایوں اور بے شمار ایسے لوگ ہیں جو کنجاہی صاحب کی ذات پر' ان کی شخصیت' ان کے فن اور ان کی فکر کے حوالے سے بہت کچھ کہہ چکے ہیں اور ابھی ان کا بہت سا کام ایسا ہے جس پر ابھی بات شروع ہونا ہے' جس پر ابھی بحث کا آغاز ہونا ہے- اور وہ بہت سے نئے فکری زاویے ابھی زیرِ بحث آنا ہیں جن سے شریف کنجاہی صاحب کی اپنی ذات تشکیل پا رہی ہے جو شریف کنجاہی

صاحب کی ذات کے توسط سے ان کی تحریروں میں رچ بس چکے ہیں اور ہنوز وا کشا ہونا باقی ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے شریف کنجاہی صاحب پر اپنی تحریر میں کم و بیش وہ سبھی باتیں کہہ دی ہیں جو ان کی شخصیت اور فن کا جامعہ مطالعہ بھی ہیں اور بھرپور اظہار بھی۔ ان کی ذات میں موجود عجز و انکساری، فقر و درویشی، ان کی علمیت، تصوف اور صوفیاء سے عقیدت، پنجابی اور اردو ادب میں ان کی حیثیت سبھی کچھ انہوں نے اس مضمون میں سمو دیا ہے۔ تو میں بھی اپنی بات کا آغاز انہی کے مضمون کی چند سطروں سے کرتا ہوں۔

''۸۷ میں مجھے پاکستانی زائرین کے قافلے کے ساتھ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی آستان بوسی کے لئے دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وزارت مذہبی امور نے زائرین کی جو فہرست میرے حوالے کی میں نے اس میں پڑھا اور مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اسی قافلے میں تین اہل قلم یعنی پروفیسر شریف کنجاہی، پروفیسر خاطر غزنوی اور امین راحت چغتائی بھی شامل تھے۔ شریف صاحب سے ملاقات ہوئی اور ان کے ہم وطن بزرگ شاعر غنیمت کی مثنوی ''نیرنگ عشق'' کا شعر ذہن میں ابھرا:

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

دونوں میں قدرِ مشترک شاعری کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مولانا غنیمت ولد اور سیر مکتب تھے۔

بمکتب کی دو طفل پری زاد مبارک باد مرگ نو بہ استاد

اور شریف صاحب بذاتِ خود ایک دبستان۔ ملاقات ہوئی، جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ دبلے پتلے، مختصر سی سفید داڑھی، عقابی آنکھیں، روشن پیشانی، چہرے پر نرمی اور ملائمت، شلوار قمیص میں ملبوس، شخصیت سے نفاست اور لطافت کا اظہار۔۔۔'' یہ ہی کچھ رنگ و آہنگ ہے شریف کنجاہی صاحب پر جناب اسلم فرخی کے مضمون کا۔

آئیے! اب ہم اس شخصیت سے تفصیلی ملاقات کرتے ہیں:

زاهد حسن

زندگی نامہ

''بندہ جب اپنے وزن سے خود واقف ہو جائے تو اس بات سے بے نیاز ہو جاتا ہے کہ دوسرے پلڑے میں کوتوال شہر کے الزامات کی فہرست ہے یا چاند سورج اور رب کا فرمان پڑا ہے یا ئمیاروں کی ہنسی۔ کنجاہی صاحب اب عمر' تجربے اور مشاہدے کے اس مقام پر ہیں جب جھوٹ برتنے اور سچ بولنے کا ہوکا ختم ہو جاتا ہے۔''

شریف کنجاہی صاحب کی ذات کے عناصر سے ترتیب پانے والی ان کی شخصیت' ان کا فن اور ان کی زندگی شاہین مفتی کے اوپر درج لفظوں کی غماز ہے اور تائید مزید کے طور پر ان کا ایک اور حوالہ درج کیا جا سکتا ہے جو اس عبارت میں سے ہے جو پروفیسر خالد ہمایوں کے شریف کنجاہی صاحب سے کیے گیے طویل ترین انٹرویو پر مشتمل کتاب میں بطور دیباچہ شامل ہے۔ کتاب کا نام ''ویرتوں کنجاہ دا ایں'' ۱۴۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کیا ہے گویا کہ ایک دستاویز ہے جو کنجاہی صاحب کی زندگی' ان کے فن اور ان کے نظریے پر مشتمل ملفوظات سمیٹے ہوئے ہے۔

''شریف کنجاہی صاحب پاک و ہند میں پنجابی زبان کی لسانی' تاریخی' انقلابی' تحقیقی' مذہبی اور تنقیدی صورتِ حال کی تبدیلیوں کے وہ وعدہ معاف گواہ ہیں جنہیں غلامی اور معاشی عدم تحفظ کے عذاب کو سہنا پڑا اور یارانِ مہرباں سے بچھڑ کر آزادی کا گھونٹ بھی پیا۔ پریت نگر سے آسوں مرادوں کی اندھیر نگری تک کے طویل سفر میں ''سورج' سوچ اور سائے'' باہم یکجا ہو گئے ہیں اور اب ایک امید رہ گئی ہے ''اوڑک ہوندی لو۔''

جس طرح کہ شریف کنجاہی صاحب کا فن اس طویل تاریخی' سیاسی' سماجی اور تہذیبی عہد کا احاطہ کرتا ہے' شاہین مفتی کے یہ الفاظ جناب شریف کنجاہی کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہیں۔ اپنی بات کو

اور زیادہ معتبر بنانے' اسے اعتبار دینے اور گفتگو میں معاری لب ولہجہ اختیار کرنے کے لئے ادب کے دو اور معتبر ترین دانشوروں ریاض احمد اور سہیل احمد خان کی باتیں یاد آتی ہیں ---اور میں سمجھتا ہوں کہ میں خود جس بے اعتباری کا شکار ہوں پڑھنے والا اس سے محفوظ رہے- اور شریف کنجاہی صاحب کی ذات جو حدِ اعتبار تک رسائی کا ایک وسیلہ ہے اور زیادہ نمایاں ہو کر اور زیادہ ابھر کر سامنے آسکے- اور پھر ادب اور زبان کے ساتھ ساتھ شخصیت کو تادیر زندہ رہنے کے لئے جس خاص قسم کی بیگانگی اور احساسِ مغائرت کی بات کی گئی ہے- یہ بے نیازی اور مغائرت بھی شریف کنجاہی صاحب کی ذات کی صورت میں آپ کے سامنے آنے والی ہے- دنیا کو اہلِ دنیا کو اور مسائلِ دنیا کو اپنے ہمراہ لئے-

ریاض احمد لکھتے ہیں:

''اقبال کے فوراً بعد نئے لکھنے والوں کے سامنے دو چیلنج تھے' بعض نے نظریات کا سہارا لے کر اور بعض نے آزاد خیالی کو رہبر بنا کر شعر کی دنیا میں نئی منزلوں کی تلاش شروع کر دی- ظاہر ہے کہ انگریزی شاعری کے اسالیب بھی ان کے سامنے تھے اور نظریاتی سطح پر کچھ مبہم تصورات بھی جنہیں ترقی پسندی کا نام دیا جاتا تھا- شریف کنجاہی نے ترقی پسند تحریک سے اپنی وابستگی پر کبھی نادم ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی- لیکن اس کے ساتھ ان کے ہاں کلاسیکی رچاؤ بعض رجحانات میں بہت واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے- اُپج اور جرأت نے ہر منزل پر ان کا ساتھ دیا- اس لئے اردو کے اچھے بھلے شاعر ہوتے ہوئے انہوں نے پنجابی کو درخورِ اعتنا سمجھا' اور شعر' نثر' تنقید' تحقیق' لسانیات اور تراجم غرض کوئی شعبۂ ادبی سرگرمی ایسا نہ تھا جس میں انہوں نے بھرپور کردار ادا نہ کیا ہو-''

یہ اُس ہم عصر کی اپنے اُس ہم عصر کے بارے میں رائے ہے جن کی عمروں نے انہیں کم وبیش ایک ساتھ ہی تاریخ کے دھارے کو بہتا دیکھا ہے اور سیلابِ زمانہ اور امتدادِ زمانہ کو اپنی تخلیقات کا کا موضوع بنایا ہے- جبکہ سہیل احمد خان وہ معتبر نقاد ہیں جن کی عالمی ادب کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کے ادب پر بھی گہری نظر ہے- ان کی بات اعتبار کی حیثیت رکھتی ہے تو کیوں نہ ان سے بھی اعتبار کی سند حاصل کر لی جائے:

''شریف کنجاہی معاصر پنجابی ادب کے مشاہیر میں شامل ہیں' ان کی شاعری نے پنجابی نظم و غزل میں جدت کے نقوش ابھارے ہیں- نئی پنجابی شاعری کے طرز احساس میں ان کے شاعرانہ لہجے کے اثرات ایک فعال عنصر کی طرح شامل ہیں-

شریف کنجاہی کی شاعری میں جذبہ اور فکر کا متوازن امتزاج ہے- وہ گردوپیش کے حقائق کو حیرت سے بھی دیکھتے ہیں اور تجزیاتی نگاہ سے بھی- ان کی شاعری میں ہمارا سماجی منظر نامہ بھی موجود ہے اور ان مناظر سے وہ زندگی کی بنیادی صداقتوں کی طرف بھی سفر کرتے ہیں- ان کا شعری اسلوب ماہرانہ ہے- ان کے کلام کی فکری گہرائی اور ان کے لہجے کی تاثیر نے انہیں جدید پنجابی شاعری میں منفرد مقام عطا کیا ہے-''

یہ وہ لفظ ہیں جن کی صداقت ہمیں شریف کنجاہی صاحب کی شاعری مہیا کرتی ہے- ان کی پنجابی شاعری اور ان کی اردو شاعری------لیکن ان کی شاعری' ان کی نثر' ان کی تنقید اور تراجم کی طرف رجوع کرنے سے پہلے ہم اس خاندان اور اس خطۂ زمین گجرات کی طرف بڑھتے ہیں جہاں ادب کا یہ روشن ستارہ طلوع ہوا اور جسے علم و ادب کا مرکز ہونے کے ناتے ''خطۂ یونان'' کے لقب سے نوازا گیا اور مولوی غلام محی الدین کی طرف دیکھتے ہیں جہاں اس روشن ستارے کی روشنی ضوفشاں ہے-

ویر توں کنجاہ دا ایں

کنجاہی صاحب کی ایک نظم ہے ''ویر توں کنجاہ دا ایں'' پنجابی شعری ادب ہی میں نہیں بلکہ شریف کنجاہی صاحب کا شعری اور ادبی میلان و رجحان سمجھنے کے لئے بھی اس نظم کا مطالعہ لازم ہے- یہ نظم ان کے اس ماہرانہ شعری اسلوب کی نمائندہ بھی ہے' جس کی نشان دہی سہیل احمد خان نے کی ہے:

ویر توں کنجاہ دا ایں------؟

تیرا ناں شریف اے-----؟

اگے ای میں آکھدی ساں' لگدا تے اوہوائے

اج کیہا نیک دیہاڑا اے
رب نے بھرا میل دتا اے
منڈیا ایہہ تک تیرا ماما ایں
مینوں توں سنجانیا نہ ہووے دا
کدے نکے ہوندے اسیں رل کے تے کھیڈ دے ساں
''میرا ناں نیا متے'' دے
مہر نور دین دی میں دو ہتری آں
ملدیاں دے ساک نیں تے واہندیاں دے کھوہ نیں
کدے ورھا ورھا او تھے جا کے رہ آوی داسی
اج اوہناں تھاواں نوں وی ویکھنے نوں سہکنی آں
میرے اتوں پتہ ای جے مامی ساڈے نال افسوس سی
ویردس ایہدے وچ میرا کیہ قصور سی------؟
نانکیاں نالوں مینوں اگے تھاں کیہڑی سی
ماپیاں دے اگے پروھیاں نئیں بولدیاں
وجے ہوئے شرماں دے جندرے نہ کھولدیاں
اوہناں نوں جمیاں توں اگے شے کیہڑی اے
اوہناں دا اوہ برا کدے منگ نئیں سکدے
ہڑاں دے دھریمیاں چ تلک انج پئی داسی
اکھیاں پیونوں جدوں بار دے گئیاں سن
دکھاں دیاں ساڈے اُتے وائیں جھل پئیاں سن
نانکے وی گئی کھسکان لگ پئے سن
تک کے تے--------
کھڑن دی تھاویں مرجھان لگ پئے سن
اسی پچی آوی ساں تے اگ پئی بھجدی سی
اوس ویلے جدوں کوئی گل وی نہ سجھدی سی

ہر شے چھڈ گئی

ایس دے پیو میرے پیو دی بانہہ نپ لئی

مرن لگا ایس نوں زبان اوہ دے گیا

ٹھیک اے جے میرا اوہدا عمر وچ ہان نہیں

پر ویرا آپ توں سیانا ایں

جیہڑی دھی نوں ماپیاں دی عزت دی پچھان نہیں

اوہ وی انسان نہیں

میں تے لے کے بہہ گئی ساں ایس خیال نوں

جاگ لائی سوکن دے پیتے ہوئے دُدھ دے جنجال نوں

رب میرا صبر قبول کر لیندا اے

مینوں ایہہ چن جیہا پت دے دیندا اے

لے پھیر میں تے ہن ایتھے لہہ پینا ایں

تینوں کیہہ ہویا اے اج ایتھے لہہ بہو کھاں

اک رات بھلی ہوئی بھین دے وی کول چل رہو کھاں

اچھا، جگ جیوندیاں دے میل نیں

میرے ولوں سبھناں نوں بہت بہت پچھنا---------!

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم شریف کنجاہی صاحب کی فکر ان کے نظریئے اور اسلوب کی بات کریں گے تو اس ضمن میں ان کی شاہکار نظم ''ویر توں کنجاہ والا ایں'' پر نظر آن ٹھہرے گی لہٰذا ان کی ذات اور شخصیت پر بات کرنے سے پہلے جب ہم اس نظم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک جامع صفات اور پنجاب کے کلچر کی روح کو اپنے وجود میں سمٹتے دکھائی دیں گے شریف کنجاہی صاحب کے انسانی جذبات وافکار کی عکاس اور معاشرتی ماحول کی ترجمان ہے یہ نظم۔ اس نظم میں بچپن ماضی کی یادوں اور ماحول کو جس سادگی کے ساتھ انہوں نے ''نیامتے'' کے ذریعے بیان کیا ہے۔ لگتا ہے آپ سٹیج پر ہو رہا کوئی ڈرامہ دیکھ رہے ہیں جس میں کچھ کردار اور واقعات بالکل ویسے' بالکل وہی ہیں جو آپ کی ترجمانی کر رہے ہیں' یا جن سے آپ مل چکے ہیں۔ نظم میں ایک دیہاتی بہن کی سادگی' اس کی معصومیت' گفتگو میں کھلے انداز اور ایک ہی سانس میں پورے ماضی' ماضی کی قدروں' میکے' سسرال'

سوکن اور باپ کی خواہش میں سر جھکائے کھڑی بیٹی کی جس المناک انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے، فنکارانہ ہنروری کا عمدہ نمونہ ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ ہم اس نظم کے ذریعے شریف کنجاہی کے فکروفن کا انسانی، نفسیاتی، تہذیبی اور سماجی سطح کا مطالعہ کر سکتے ہیں تو بہت حد تک درست ہوگا۔ لیکن سب سے پہلے ہم چلتے ہیں سن ۱۹۱۵ء کی ۱۳ اکتوبر کی طرف جب شریف کنجاہی صاحب سے اس دنیا کی پہلی آشنائی ہوئی تھی۔ لیکن درحقیقت یہ ان کی درست تاریخ پیدائش نہیں اس لئے آشنائی کا قیافہ بھی درست نہیں۔

تاریخ پیدائش اور اس سے جڑی یادیں

پنجابی شاعری کے انتخاب ''سجرے پھل'' میں جسے ترتیب دیا ڈاکٹر انیس ناگی نے اور اپریل ۱۹۵۹ء میں پنجابی مجلس، لاہور نے شائع کیا۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۵ء کی ہی درج ہے۔ جبکہ قریشی احمد حسین احمد قلعداری نے ''پنجابی ادب کی مختصر تاریخ'' (۱۹۶۴ء) میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء درج کی ہے۔ شازیہ خورشید نے اپنے ایم اے اردو کے مقالے ''شریف کنجاہی کی ادبی خدمات'' پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۹ء میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۵ء درج ہے۔ ماہنامہ ''زجاج'' گجرات فروری مارچ ۱۹۹۱ء میں چھپنے والے اپنے ایک انٹرویو میں بھی کنجاہی صاحب نے یہی تاریخ بتائی ہے۔ عبدالغفور قریشی نے ''پنجابی ادب دی کہانی'' پنجابی ادبی بورڈ، لاہور ۱۹۹۳ء میں ریاض احمد نے ''ادبی نکھار'' اور حمید اللہ ہاشمی نے ''پنجابی زبان و ادب (اردو) میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء تاریخ پیدائش لکھی ہے۔ انہوں نے پروفیسر خالد ہمایوں سے طویل ترین انٹرویو 'ویرتوں کنجاہ دا ایں'' میں لکھا ہے

> ''میرے والد صاحب کا نام غلام محی الدین، دادا کا محمد امین اور ان کے والد کا نام حسام الدین تھا۔ میرے والد صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۸۸۵ء اور تاریخ وفات ۱۹۵۹ء ہے۔ دادا جی کو اپنی ہوش میں دیکھا ہے، وہ ۱۹۳۷ء میں فوت ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی تقریباً والد صاحب جتنی ہی عمر پائی تھی۔ اس لحاظ سے کئی بار سوچتا ہوں کہ میں اپنی جدی عمر سے آگے چلا گیا ہوں۔

المیر ٹرسٹ لائبریری، گجرات کی طرف سے غفور اسلم کی تصنیف ''شریف کنجاہی انکار سے اقرار تک'' جنوری ۲۰۰۵ء میں اسی سوال کے جواب میں کنجاہی صاحب فرماتے ہیں:

''سانسوں کا سفر دراصل زندگی کا انتظار ہے' ریکارڈ کے مطابق میری تاریخ
پیدائش ۱۱۳ کتوبر ۱۹۱۵ء ہے۔ بعد میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ۱۱۳ کتوبر
کوئی صحیح تاریخ نہیں' چونکہ میں رمضان کے ماہ میں پیدا ہوا تھا' مجھے پوری
طرح معلوم نہیں کہ کون سا دن تھا' البتہ میری پیدائش ۱۳۳۳ ہجری کے ماہ
رمضان میں ہوئی' جس کے تحت یہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۴ء بنتی ہے۔''

جب کہ المیر ٹرسٹ لائبریری گجرات ۲۰۰۰ء ہی کے زیر اہتمام پروفیسر حامد حسن سید کی تخلیق' شریف کنجاہی کی پرورشِ لوح وقلم'' میں تھوڑے اختلاف کے ساتھ کچھ یوں بیان کیا ہے انہوں نے:

''شریف کنجاہی کنجاہ میں ۱۳ مئی ۱۹۱۴ء کے ماہ رمضان میں پیدا ہوئے۔
از روئے اسناد تاریخ پیدائش ۱۱۳ کتوبر ۱۹۱۵ء ہے۔ شریف کنجاہی کے والد
صاحب مولوی غلام محی الدین تھے۔ تاریخ پیدائش ۱۸۸۵ء اور سن وفات
۱۹۵۹ء ہے۔ دادا جی کا نام نامی مولوی محمد امین تھا۔ سن وفات ۱۹۳۷ء ہے۔''

ماہنامہ ''رزم نو'' گجرات (جلد ۲۔ شمارہ ۹۔۸) میں کنجاہی صاحب کا جو انٹرویو شائع ہوا ہے اسمیں انہوں نے کہا مگر قرائن یہ بتاتے ہیں کہ یہ تاریخ غلط ہے۔ میرے بزرگوں کے بقول میں رمضان میں پیدا ہوا تھا۔ تقویم کے حساب سے میری تاریخ پیدائش ۱۳ مئی ۱۹۱۴ء ہے۔

پنجابی لوک کہاوتوں میں یہ قصبہ '' کنجاہ'' عجیب وغریب روایات رکھتا ہے۔ کنجاہ گجرات شہر سے مغرب کی طرف چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جہاں شریف کنجاہی صاحب پیدا ہوئے۔ اب یہ قصبہ کنجاہ اور کنجاہی صاحب ایک دوسرے کے نام کا حصہ ہیں' ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔

اس وقت کا کنجاہ ان کے سانسوں میں آباد ہے ''ساہواں دا ویزہ'' کی
صورت میں کنجاہ کو ماضی کے کنجاہ کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''صحیح اعداد وشمار تو یاد نہیں البتہ آبادی ہزاروں میں تھی۔ کنجاہ اس وقت کوئی بڑا
قصبہ نہیں تھا' ایک چھوٹا موٹا سا کاروباری سنٹر تھا اس لئے کہ سڑکیں اتنی زیادہ
نہ تھیں' جو تھیں وہ کچی اور ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ان دنوں آمد ورفت کا بہترین وسیلہ
تانگہ تھا۔ لاریاں' بسیں تو بہت بعد میں آئیں۔ اس وقت ہمارے قصبے کے

لوگوں کا گجرات تک پہنچنا دشوار تھا۔ چھوٹے موٹے دیہاتوں میں رہنے والوں کی خریداری کا مرکز کنجاہ تھا۔ یوں اس کی ایک حیثیت بنتی تو تھی۔ جہاں تک تعلیمی صورتِ حال کا تعلق ہے تو انگریزوں کے پنجاب پر قبضے کے بعد سکول کھل گئے تھے لیکن زیادہ تر سلسلۂ تعلیم مساجد ہی میں جاری وساری تھا۔ ہمارا اپنا خاندان ایک مسجد کے قریب آباد تھا' ایک ہی گھر تھا۔ وہاں پر گزر بسر ہو رہی تھی۔ وہاں پر زنانہ درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگوں کا تعلیم کی طرف زیادہ رجحان تھا نہیں۔ ناظرہ قرآن شریف پڑھ لینے کو ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ بھی بہت کم تھا۔ میں جب یاد کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے' اپنے محلے کے دو تین گھروں کے علاوہ جن کا کام ہی پڑھنا پڑھانا تھا' محلہ کے باقی پچیس تیس گھروں میں سے شاید ہی کوئی بندہ ہوگا جس نے قرآن مجید یا پورا سیپارہ پڑھا ہو۔

جہاں تک میری تعلیم کا تعلق ہے تو اس میں میری والدہ محترمہ کو عمل دخل حاصل ہے۔ شریف کنجاہی صاحب نے اپنی والدہ کے بارے میں اپنی یادیں روشن کرتے ہوئے کہا۔ "فضل نور' ہاں یہی نام ہے میری والدہ محترمہ کا' وہ علم کا شوق رکھتی تھیں' انہوں نے میرے دادا جی سے گلستان' بوستان جیسی فارسی کی کتب پڑھ رکھی تھیں اور وہ اڑوس پڑوس کی بچیوں کو بھی کتابیں پڑھایا کرتی تھیں' اس سے ہمارے گھر میں علم کا ماحول رہا۔

پھر وہ اس وقت کے معاشرتی اور سماجی ماحول کا ذکر کرتے ہیں۔ اس وقت کے مشترک ہندوستان میں مشترک تہذیب کے حامل کنجاہ کی صورتِ حال کو انہوں نے ایک حقیقی واقعہ میں بیان کیا ہے:

مجھے یاد ہے کنجاہ میں جب ہم پڑھتے تھے تو شہر میں مسلمانوں کی کوئی دکان نہ تھی' صرف ہندوؤں کی دکانیں تھیں۔ حلوائی کی ایک دکان تھی وہ بھی ہندو کی تھی۔ اس نے مسلمانوں کو دہی کی لسی دینے کا ایک منفرد طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ اس نے دکان پر ایک چھکا لٹکایا ہوا تھا' جس میں ایک پیالہ پڑا ہوتا تھا۔ لڑکے لسی پینے جاتے' یونہی ذرا عیاشی کے لئے' کیونکہ لسی' دودھ

گھروں میں عام تھا۔ مسلمان گاہک نے پیالہ چھکے میں سے نکالنا' ہندو حلوائی نے دہی بلو کر اپنے برتن میں سے لسی اس پیالے میں الٹ دینی لیکن لسی والا برتن پیالے سے ذرا اونچا ہی رکھنا۔ لسی پی کر گاہک نے خود ہی پیالہ صاف کر کے اس چھکے میں دوبارہ رکھ دینا۔ بہر حال یہ عام تھا' اس لئے اس کا برا نہیں منایا جاتا تھا۔ البتہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندو کے اس رویے کے بارے میں میرے اندر ایک ری ایکشن (ردعمل) ضرور تھا۔ میں اسے برا سمجھتا تھا اور شاید اور لوگوں کے اندر بھی ہو۔ اسی لئے تو پاکستان کے خواب کی تعبیر ممکن ہوئی۔

شریف کنجاہی صاحب کے ماضی میں تاریخ کا ایک باب روشن ہے۔ اور خوب صورت اور خوش کن بات یہ ہے کہ یہ روشن باب آئندہ نسلوں تک پہنچا ہے۔ ان کی تخلیقات کے ذریعے' ان سے مختلف لوگوں کی گفتگوؤں کے ذریعے' ان کی اپنی یادداشتوں کے ذریعے اور ان رسائل و جرائد کے ذریعے جو وقتاً فوقتاً کنجاہی صاحب کی فکر ان کی شخصیت کے حوالے سے اپنے صفحات مختص کرتے رہے ہیں۔ اس عہد میں ایک اہم مسئلہ قانون زمین داری سے متعلق تھا جسے انہوں نے پروفیسر خالد ہمایوں سے اپنی گفتگو میں موضوع بنایا ہے۔

''گورنمنٹ نے ایک ایسا سسٹم بنا رکھا تھا اگر ہندو نے کسی مسلمان سے زمین اپنے قبضہ میں لینا ہوتی تھی تو وہ اپنے اعتبار کے کسی مسلمان کے نام اندراج کرواتا۔ اس قسم کا قانون پنجاب کے وزیر سر چھوٹو رام نے بنوایا ہوا تھا۔ اس قانون کو ہندو اپنے لئے ''کالا قانون'' کہتے تھے۔ مجھے کنجاہ کی حد تک ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی مسلمان نے ہندو کی خریدی ہوئی زمین پر اپنا قبضہ جما لیا ہو۔''

تعلیم اور اسباق ماضی

اگر عمومی طور پر دیکھا جائے اور ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ کنجاہی صاحب نے ۱۹۳۳ء میں ایف اے کیا۔ گورنمنٹ انٹر کالج گجرات سے، جس کا موجودہ نام گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج گجرات ہے۔ ۱۹۴۳ء میں منشی فاضل (بی اے) میں بی ٹی سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ۱۹۵۴ء میں ایم اے اردو اور ۱۹۵۶ء میں ایم اے فارسی کیا۔

۱۹۳۳ء ہی میں نذر بیگم سے شادی ہوئی جن میں سے ایک بیٹی خالدہ یوسف ہیں۔ بیوی کا انتقال ۱۹۸۱ء میں ہوگیا۔ تلاشِ روزگار میں لاہور، اسلام آباد وغیرہ رہے لیکن ہمیشہ واپس گجرات کی تمنا لئے۔ اور عرصہ دراز سے ۶۱۔ مرغزار کالونی گجرات میں مقیم ہیں۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی کہ کم و بیش ایک صدی کا قصہ ہے۔ تو جب اس صدی کے سن وار ٹکڑے کئے جائیں تو ان کی شکل کچھ یوں بنے گی اور کنجاہی صاحب پر یوں منطبق ہوگی۔

۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۹ء	اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ میں بطور سینئر انگلش ٹیچر رہے۔
۱۹۵۱ء	اسلامیہ ہائی سکول شادیوال میں پڑھایا
۱۹۵۲ء	پبلک ہائی سکول کنجاہ میں تعینات رہے
۱۹۵۳ء	گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ
۱۹۵۷	گورنمنٹ کالج سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی لیکچرار اردو (یہ عارضی تقرری تھی)
۱۹۵۸ء	گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب
۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۲ء	گورنمنٹ کالج کیمبلپور (اٹک) لیکچرار فارسی
۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۷ء	گورنمنٹ کالج گوجر خان لیکچرار
۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۲ء	گورنمنٹ کالج جہلم (لیکچرار فارسی)

بات یہ تھی کہ پبلک سروس کمیشن میں اردو اور فارسی میں منتخب ہوئے، فارسی پڑھانے کو ترجیح دی۔ اس دوران چند ماہ الہ موسیٰ اور تلہ گنگ میں بھی پڑھایا۔

۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۰ء تک گورنمنٹ کالج جہلم (لیکچرار فارسی) رہے۔ جہلم سے ریٹائرمنٹ کے بعد یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ پنجابی میں مامور ہوئے اور ۱۹۸۰ء تک پڑھایا۔

۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۸ء مقتدرہ قومی زبان کے ماہنامہ اردو سے منسلک ہوئے اور ۱۹۸۸ء میں واپس گجرات چلے آئے۔ تب سے تحریر و تصنیف میں مصروف ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو ۱۹۳۳ء تا ۱۹۸۸ء کے دوران پچپن برس کا عرصہ جو نصف صدی سے اوپر تک محیط ہے، کنجاہی صاحب نے وطن عزیز کی نسل نو کی تعلیم و تربیت کرنے، انہیں شعور عطا کرنے میں صرف کر دیے۔ اور آج تک وہ اپنی ذات کو ایک روشن چراغ بنائے ہوئے ہیں۔ اس دوران ۳۳ (تینتیس) کے قریب اہم ترین کتب تصنیف کیں، تراجم کئے، تحقیق میں مصروف رہے اور تنقیدی محاکمے کئے۔ گویا ہر سانس کے ساتھ ان کا تخلیقی کام جاری رہا ہے۔ اس سفر میں اور رہبروں اور ہمراہیوں کے ساتھ انہیں علی عباس جلالپوری صاحب (مرحوم) کی ہمراہی بھی میسر آئی۔ جب کنجاہی صاحب نے ۱۹۳۰ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ انٹر کالج گجرات میں داخلہ لیا، علی عباس جلالپوری ان کے ہم جماعت تھے۔ شاعری کی تحریک بھی انہیں سے ہوئی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ''علی عباس جلالپوری کو میں نے خط لکھا اور اس میں جھجکتے ہوئے ایک نظم بھی بھیج دی۔ اس نے بہت تعریف کی اور ہر چند کہ وہ تعریف محض دوست نوازی تھی لیکن مجھے ایک فریب نفس میں مبتلا کر گئی اور شعر گوئی اب خبط کی حد تک پہنچ گئی۔''

جب کہ میرے خیال میں علی عباس جلالپوری کی ان کے لئے تعریف محض دوست نوازی نہ تھی ورنہ ان کی نظم ''پسپائی'' ہی میراجی کو اس قدر پسند آتی اور نہ ہی بعد میں اردو غزل کے رجحان ساز شاعر، نقاد اور دانشور فراق گورکھپوری اسے ایک دوسرے انتخاب میں شامل کرتے ہوئے یہ لکھتے:۔

> ''شریف کنجاہی کی نظم سنئے عنوان ہے ''پسپائی'' آزاد نظم کی ایک مثال، مصرعے کہیں چھوٹے، کہیں بڑے، ردیف و قافیہ سے بھی یہ نظم آزاد ہے۔ تشبیہیں اور استعارے اور اشارے بھی صرف نئے نہیں ہیں بلکہ پرانے شاعروں کو تو جانے دیجئے آج کے وہ شاعر بھی جن کی عمریں ادھیڑ ہو چلی

ہیں' یہ انداز بیان سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ شعور اور تحت الشعور' خیالات کی پرچھائیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ نفسیاتی اور ڈرامائی خود گویائی یا مکالمے اردو شاعری میں نئی چیز ہیں۔ نئی اردو شاعری کی روپ ریکھا' اس کے خدوخال اور اس کی نوک پلک کی تیاری میں ایسی نظموں کا خاص حصہ ہے۔''

یہ سب کچھ تو شریف کنجاہی صاحب کے فن کے اعتراف کے ضمن میں آتا ہے۔ لیکن بات ہو رہی تھی شریف کنجاہی صاحب کی تعلیم کی جو ایک بار انٹرمیڈیٹ کے بعد رک گئی تھی اور پھر اس سلسلے کو کس طرح جاری کیا جا سکا اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

''شادی کے بعد اخراجات کا بڑھنا لازمی عمل ہوتا ہے۔ اخراجات بڑھنے سے ذہنی اور جذباتی کیفیات بھی کچھ عجیب سی ہو جاتی ہیں۔ تب والد صاحب نے مجھ سے یہ ضرور کہا کہ باہر کی دنیا کے بہت مسئلے ہیں لیکن گھر کے یہ جو چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں' ان کا بھی کچھ تقاضا ہے۔ اس میں دشواری یہ آئی کہ میں سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتا ہوا اس قدر آگے نکل چکا تھا کہ سرکاری ملازمت ملنا ناممکن تھا۔ بہرکیف میں نے ایک دو کوششیں کیں جو ناکام رہیں۔ جب تھانے سے رپورٹ آتی تو ملازمت کیسے ملتی؟ ان کے لئے اور خود میرے لئے کئی سال بے حد پریشانی کے گذرے۔ بہتری کا کوئی فوری حل میرے پاس موجود نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں ایف اے کرنے کے بعد آگے پڑھ تو سکتا نہیں' اس لئے میں بی اے پرائیویٹ طور پر کرلوں اور کسی سکول میں استاد ہو جاؤں۔ والد صاحب سکول کی زندگی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے اس میں کیا دھرا ہے؟

ان کے ایک بے حد قریبی دوست بھی تھے' رضاعی بھائی بھی تھے۔ وہ ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں بھی ادھر چلا جاؤں' لیکن ادھر بھرتی اتنی آسان نہ تھی۔ انہوں نے وقتی طور پر مجھے ادھر ایڈجسٹ کروا دیا۔ پھر وہی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ سیاسی وابستگی کے سبب یہ ملازمت جاری نہ رہ سکی۔ چنانچہ مجھے وہی طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ میں پانچ چھ برس دھکے کھانے

کے بعد پھر منشی فاضل کی طرف چلا آیا۔ پھر بی اے اور پھر بی ٹی میں لاہور میں داخلہ لے لیا۔ مجھے خط آیا کہ یہاں ایک دو سیٹیں خالی ہیں اگر تم داخلہ لینا چاہتے ہو تو چلے آؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ شریف کنجاہی صاحب جس طرح کہ وہ خود کہتے ہیں:

''ان کا خاندان یہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا' بی ٹی کی فیس نہیں دی جا سکتی تھی اور پھر باقی علیحدہ سے اخراجات بھی تھے۔ یہاں ان کی وفا شعار بیوی نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ جو مشکل تھا' اس حوالے سے کہ اس میں والدین سے اخفاء بھی لازم تھا کہ ان کی بیوی نے والدین کو بتائے بغیر اپنا زیور بیچ دیا۔ مسائل تھے جن کا سامنا شریف کنجاہی صاحب کے لئے ایک امتحان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یوں انہوں نے زیور سے حاصل ہونے والی رقم سے داخلہ لیا اور دیگر اخراجات کے لئے ادھر ادھر کام کی تلاش بھی جاری رکھی انہوں نے۔''

یہی وہ دن تھے جب ان کی ملاقات پنجابی ادب کے اہم نام سجاد حیدر سے ہوئی جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو میں تھے۔ اس وقت تک بطور شاعر شریف کنجاہی صاحب ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے۔ جب سجاد حیدر صاحب کو علم ہوا کہ وہ لاہور آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کنجاہی صاحب کو ریڈیو اسٹیشن پر متعارف کروانا شروع کیا۔ یوں انہوں نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے کچھ کام تلاش کر لئے۔ بی ٹی کرنے کے بعد ان کی زندگی کچھ ہموار ہو گئی۔ کنجاہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں بطور استاد انہیں ملازمت مل گئی۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔

شعرائے گجرات اور اُن سے جُڑی یادیں

شریف کنجاہی صاحب کی یادوں میں، ان کے ماضی میں بے شمار کردار ایسے ہیں جنہوں نے بعد ازاں ہماری قومی، ملی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی یادوں میں کئی ایسے روشن واقعات بھی ہیں جن سے ہماری زندگیوں کا منظر نامہ رنگین ہے۔ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے، احرار کے حوالے سے اور اس عہد کے اردو، فارسی اور پنجابی شاعروں کے حوالے سے یادداشتوں کا ایک عظیم خزینہ لئے ہوئے ہیں۔ شریف کنجاہی صاحب کی ذات، اس عہد کے ایک معروف شاعر تھے عبداللطیف افضل، جن سے کنجاہی صاحب کا تعارف ۳۱۔۱۹۳۰ء کے زمانے میں ہوا تھا۔ پہلی بار کنجاہی صاحب کا تعارف جاندار سیاسی اور مذہبی رجحان رکھنے والے جس شاعر سے ہوا، وہ پنجابی کے بھی شاعر تھے۔ جن کی شاعری کی چاشنی اور ترفع دیر تک کنجاہی صاحب کی سماعتوں میں گھلتا رہتا تھا، کنجاہی صاحب کہتے ہیں:

> "مجھے یاد ہے کہ کشمیر کے سلسلے میں جب ۱۹۳۰ء کے قریب ایک تحریک احرار نے چلائی تھی تو اس میں افضل صاحب نے ایک بڑی خوبصورت نظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیرِ صدارت کمیٹی باغ گجرات میں ہونے والے اجلاس میں سنائی تھی۔ یہ نظم اب ان کے مسودات میں بھی شامل نہیں۔ غالباً اس لئے کہ بعد ازاں ان کے سیاسی افکار پر مذہبی افکار نے غلبہ پا لیا۔ اسی حوالے سے ان کی طویل نظم کے بعض بند بے حد خوبصورت ہیں۔ یہاں اس لئے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ لوگوں کی یاد سے بالکل ہی نہ مٹ جائیں:
>
> "جم جم، گولیاں دی بارش ہووے چھم چھم
> خون دے فوارے جان قدماں وچ جم
> جم جان قدم ایسے جان والے سارا جم
> دماں دا وساہ کیہ زندگی دے چار دم

دم دین فائدہ جنہاں دماں دا پیار ہووے
زندہ کرے قوم نوں جو قوم تے نثار ہووے

اور یہ مصرے تو بے حد معنی خیز ہیں:

مظہر علی راجے نال آپے کردا قیل و قال
تینوں کیہ پچھناں سی ایویں جمعہ جنج نال
دور تھیں سلام تینوں گوریا معاف کر
باندر آلہ ساڈے وچ توں نہ انصاف کر

یوں تو گجرات کا پنجابی اور اردو کی شعری روایت میں قابل ذکر حصہ ہے اور پنجابی اور اردو تک ہی کیا موقوف ہے' فارسی میں بھی غنیمت کنجاہی کی شخصیت تاریخ ادبیات فارسی کا جزو لاینفک بنی ہوئی ہے۔ پھر محمد بوٹا گجراتی' استاد امام دین گجراتی' محمد حسین شوق اور پیر فضل گجراتی کے نام نامی ذہنوں کی لوح پر انمٹ طور پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سائیں رحمت' سائیں فیروز نگیں اور جدید دور کے شعراء میں بشیر منذر اور عاصی رضوی کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں سے بعض شعراء کے ساتھ ان کی دلچسپ یادیں وابستہ ہیں:

''محمد بوٹا گجراتی کو میں نے یونہی دیکھا۔۔۔۔بشیر منذر صاحب گجرات کے نواحی گاؤں لاہوریاں کے رہنے والے تھے۔ جب وہ زمیندار کالج کے سٹوڈنٹ تھے تو میری ان سے شناسائی تھی۔ وہ بھی ''محب کسان'' کے نائب مدیر رہے۔ مدیر غالبا خورشید ہمایوں تھے' پھر یہ لاہور چلے گئے اور محکمہ آبادکاری میں ملازم ہو گئے' پھر انہوں نے ملازمت چھوڑ کر انارکلی بازار کے باہر شمال میں ''المینا آرٹ پریس'' لگالیا اور پرنٹنگ کا کام شروع کر دیا۔ میرا ان کے پاس کافی آنا جانا تھا۔ عاصی رضوی جو سید نہ تھے' جب پشاور سے واپس آئے تو انہوں نے گجرات شہر میں چوک پاکستان میں (شیشیانوالا دروازہ) قندفشاں کے ساتھ ایک کھمبے کے نیچے سر پر پہننے والی قراقلی ٹوپیاں بنانے کی دکان بنالی تھی۔ وہ کام کوئی زیادہ سودمند نہ تھا اور نہ شاعری کوئی بارآور تھی' ان کا زندگی کا آخری دور کوئی اچھا نہ تھا۔ ٹوپیوں کا کام بھی ختم ہو گیا اور کوئی وسیلہ نہیں تھا روزی کمانے کا' وہ مالی

پریشانیوں میں ہی گرفتار رہے۔ ''گجرات کی بیٹی'' ان کی یادگار نظم ہے جو انہوں نے مس سمیعہ نظام الدین کے بارے میں لکھی۔''

اور جہاں تک پیر فضل گجرات کا تعلق ہے وہ تو ان کی نظم ونثر کے اس درجہ قائل نظر آتے ہیں کہ انہوں نے تو ان کے لئے دو منظوم نظمیں کہہ رکھی ہیں۔ جن کا عنوان ہی ''شریف کنجاہی'' ہے اس میں سے دوسری نظم کے تین اشعار دیکھئے:

روکیاں کدرے رکدی ناہیں ایہدی قلم ترکھی
لکھنا شروع کرے تے کرداا ے لاہ تمت دی بکھی
وچ تنقید کے دی اپنے کدی نہ پگ اچھالی
گل شریف جدوں وی کرداا ے کرے شریفاں والی
بعد غنیمت طرف کنجاہ دی چمکیا سعد ستارا
سوہنی طبع خصائل عمدہ اسم شریف پیارا

دھیما پن

ٹیگور پر اپنے کام کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کنجاہی صاحب نے انہیں پسند کرنے کی ایک نفسیاتی وجہ بیان کی ہے:

''ان کے خیال میں ٹیگور کو پسند کرنے کی بنیادی وجہ اگر کوئی بنتی ہے تو وہ ہے اس کے مزاج میں دھیما پن اور ملائمت۔''

کنجاہی صاحب کا خیال ہے کہ ان کے مزاج میں تندی' سختی اور انانیت نہیں۔ اور شاید اس کا کارن یہ ہے کہ یہ جملہ خصائص انسانی اخلاق سے متضاد ہیں اور کنجاہی صاحب خود امن پسند' محبت خواو انسانی قدروں پر یقین رکھنے والے انسان ہیں۔ یہی ان کی ذات اور یہی ان کی فکر کا بنیادی نکتہ نظر آتا ہے۔ اور شاید اس میں کافی حد تک وہ حالات و واقعات بھی کارفرما ہیں جن میں سے گذر کر وہ زندگی کے اس موڑ تک پہنچے ہیں۔ اور تاریخی جبریت' جنگوں اور تقسیم کے تجربے نے ان کے اندر انسان کی قدر و قیمت کو بھی بڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاہے وہ ٹیگور کے حوالے سے بات کر رہے ہوں یا پھر پرنس کروپاٹکن کی تصنیف ''آزادی کی جنگ'' کا ترجمہ کر رہے ہوں یا رسل کی کتابوں پر ان کا کام ہو سب میں انسانی مظاہر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

اگرچہ ان کے اپنے خیال میں ان کے بچپن میں کچھ ایسی خوشگوار یادیں نہیں ہیں جو بیان کی جا سکیں' تاہم بچپن اور جوانی کا وہ زمانہ ہے جس میں انہوں نے زندگی کی اپنی محرومیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ انہی محرومیوں سے انہوں نے زندگی کے آنے والے دنوں کی تشکیل کی۔ اور وہ میاں فتح محمد آف کولیاں شاہ حسین کی زیرنگرانی فوج کے لئے ہونے والی بھرتی کے دفتر واقع موجودہ ریجنل آفس نیشنل بینک بھمبر روڈ گجرات میں چوہدری غلام فرید آف منگووال بھرتی آفیسر کے ساتھ کلرک کے طور پر عارضی طور پر کام ہو' یا پھر فوج میں بھرتی کا واقعہ جس کے

نتیجے میں ان کے اندر ایک خاص واقعہ کے سبب جنگ سے نفرت شدید ہوگئی۔ اس سب کے پیچھے بھی کہیں کنجاہ میں لوٹ آنے وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے، شعر کہنے اور نثر لکھنے کی خواہش کارفرما نظر آتی ہے۔ حقیقت کچھ یوں ہے کہ ڈاکٹر اسلم کھوکھر کے والد جوان کے والد کے رضاعی بھائی تھے اور جنہیں کنجاہی صاحب چاچا کہا کرتے تھے، انہوں نے کنجاہی صاحب کو فوج میں اپر ڈویژن کلرک بھرتی کروا دیا۔ جس کے نتیجے میں ان کی تقرری ایبٹ آباد میں فرسٹ انفنٹری بریگیڈ میں ہوگئی۔ وہاں تنخواہ سو روپے سے زیادہ تھی۔ یہ ۴۰-۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ انہوں نے وہاں جوائن تو کر لیا لیکن گورنمنٹ کا اصول تھا کہ پولیس سے ہر بندے کے بارے میں جو سرکاری ملازمت میں آتا تھا رپورٹ لی جاتی تھی۔ کنجاہ میں کنجاہی صاحب کی رپورٹ کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ ''میرے باغیانہ رویے کی شہرت عام تھی۔ کنجاہ پولیس نے میری رپورٹ میں یہ لکھ دیا کہ یہ اینٹی گورمنٹ ہے۔ شریف کنجاہی صاحب نے اپنی یادوں کے باب میں بیان کیا۔

اور یقین ان کا یہ ہے اس ضمن میں کہ دراصل خدا نے مجھے یہ زندگی عطا کرنی تھی۔۔۔۔۔ اس دوران ہی اس فرسٹ انفنٹری بریگیڈ کو حکم ہوا کہ وہ منی پور جائے۔ ان دنوں جاپان کے ساتھ جنگ جاری تھی جب کہ صورت حال یہ تھی کہ اسی یونٹ کے ایک انگریز افسر نے اپنے آپ کو ضرب لگا کر ''ان فٹ فار موالائی زیشن'' یعنی محاذ پر جانے سے نااہل کر لیا۔ لیکن اسے پھر بھی وہاں جانا پڑا اور میری جگہ ایک جونیئر کلرک کو پروموٹ کر کے جنگ کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ لیکن ہوا یہ تھا کہ اس بریگیڈ کے منی پور پہنچتے ہی اس کا صفایا ہوگیا تھا۔ جس پر شریف کنجاہی صاحب نے ایک دلدوز نظم بھی لکھی:

''جنگاں مڑ چھڑیاں کہ چھڑیاں
قوماں مڑ بھڑیاں کہ بھڑیاں
دور کتے گجدے نے جھیڑے
آوتے جدو یہڑے
کیہ ہووے دا
کیہ بنے دا
کیہ کراں گے
کدھر جاں گے

کھل مل آئے چار چوفیرے بدل جدوں سوا ہرے
مولا خیر گزارے

لیکن معاملات و مسائل جو بھی رہے ہوں ۱۹۵۳ء تا ۱۹۸۸ء کے دوران مختلف شہروں میں وقت گزارنے کے باوجود وہ پنڈی ہو یا خوشاب' پھالیہ ہو یا جہلم' کیمبل پور ہو یا لاہور۔ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ پنجابی میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ ہو یا مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں اردو کا کام۔ انہیں کنجاہ میں پلٹنے کی خواہش نے ہمہ وقت اپنی گرفت میں رکھا۔ اور بالآخر وہ گجرات آن مقیم ہوئے۔ اور گذشتہ اٹھارہ برس سے وہ وہاں تصنیف و تالیف کے کام میں لگے ہیں۔ اس دوران وہ مختلف شہروں میں علمی و ادبی اداروں کی میٹنگز میں تب تک شریک ہوتے رہے جب تک صحت اور ہمت رہی۔ لیکن ان کے لکھنے پڑھنے خط و کتابت جاری رکھنے کے عمل میں اب تک تعطل نہیں آیا۔ گجرات میں واپسی کی ایک وجہ تو کنجاہ سے قربت اور بچپن کی یادوں کا احیا' اس کی خواہش نظر آتی ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے خالد ہمایوں سے اپنے انٹرویو میں بھی کیا ہے۔ اور ان الفاظ میں کیا ہے:

"کنجاہ کی زندگی بالکل علیحدہ مزاج کی حامل تھی۔ ذرا گھر سے نکلتے اور سامنے کھیت آ جاتے۔ کھلی فضا تھی۔ فصلوں کا ایک اپنا ہی حسن ایک اپنا ہی نکھار ہوتا ہے۔ قریب ہی ایک ندی بہتی
تھی' شام کے وقت وہاں جا بیٹھتے۔۔۔۔ اور جس طرح کہ حافظ نے کہا ہے:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت
کنار آب رکن آباد گل گشتِ مصلیٰ را

یعنی حافظ کو شیراز کے قریب بہتی نہر ویسے ہی یاد آتی ہو گی جیسے مجھے لاہور جیسی جگہ رہ کر کنجاہ کی وہ ندی یاد آتی تھی۔ اس کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں لگانے کا ایک علیحدہ ہی لطف تھا۔ لاہور میں یہ بات نہ تھی۔ یہاں دوستی کی عمر دو چار سال سے آگے نہیں بڑھتی ۔"

یادِ یارِ مہرباں

زمینِ گجرات کی طرف بار بار مراجعت' وہاں قیام کرنے کی خواہش میں ایک طرف تو یہ خطہ'

کنجاہ نظر آتا ہے۔دوسری طرف وہ محبتیں اور محبوب شخصیات تھیں جن کے ساتھ ان کی فکری اور تہذیبی ہم آہنگی تھی۔اور جب گجرات اور جہلم کی تہذیبی اور فکری تاریخ کی بات ہوگی تو ایک نام ہمیشہ چمکتے ہوئے ستارے کی طرح نظر آئے گا اور وہ نام ہے چوہدری فضل حسین کا' جو جہلم میں رہتے تھے اور جن کا زیادہ تر وقت گجرات کے زمیندار کالج میں گذرا۔ یوں شریف کنجاہی صاحب سے اُن کی قربت مثالی تھی۔ یوں تو کنجاہی صاحب نے ساحرؔ اور فیضؔ صاحب سے بھی اپنی ابتدائی عمر کی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اور اس حوالے سے علامہ اقبال کی شخصیت پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے:

''فیضؔ صاحب سے میری چند ایک ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ جب وہ لاہور میں ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ غالباً ایم اے کے سٹوڈنٹ تھے اور علی عباس جلالپوری اُن کے کلاس فیلو تھے۔ وہیں ہماری ملاقات خواجہ خورشید انور صاحب سے ہوئی۔ خواجہ صاحب کے ننھیال گجرات شہر میں تھے۔ وہ بہت بڑے موسیقار تھے۔ خواجہ خورشید انور کی والدہ علامہ اقبال کی سالی تھیں۔ (جو گجرات شہر کے محلہ کٹھڑہ شال بافاں حالیہ جناح سٹریٹ کے رہنے والے اور رئیس اعظم گجرات خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی بیٹی فاطمہ بی بی کے فرزند تھے۔ یاد رہے کہ علامہ اقبال کی پہلی شادی ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی بڑی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی تھی۔) اس طرح فیض احمد فیض اور خورشید انور صاحب سے ملاقات ہوئی جسے ملاقات سے زیادہ زیارت کہہ سکتے ہیں۔ جب وہ (فیض صاحب) پاکستان ٹائمز میں آئے تو میں چونکہ احمد ندیم قاسمی صاحب کو ملنے جاتا تھا۔ اس طرح قاسمی صاحب کے ذریعے ان سے بھی ملاقات ہوگئی۔ پھر فیض صاحب سیاست میں اتنے ڈوب گئے کہ میرے جیسے آدمی کو ان سے ملنا بہت مشکل تھا۔''

جب شریف کنجاہی صاحب کی یادوں سے ہم آشنائی ہوتی ہے' ان سے آگہی ملتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ زندگی بھر ان کا تعلق خاطر ان اہلِ علم سے رہا جو اہلِ دل بھی تھے۔ ان اہلِ علم جو اہلِ دل بھی تھے میں سے ایک نام چوہدری فضل حسین کا تھا جو اب ہم میں نہیں رہے۔ محمد حنیف رامے کی یاد میں اکادمی ادبیات (لاہور شاخ) کی ایک تقریب میں صدارتی گفتگو کے دوران انتظار حسین

نے محمد سلیم الرحمٰن، غالب احمد، ناصر کاظمی اور صلاح الدین محمود وغیرہ کے ساتھ شیخ صلاح الدین کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگرچہ شیخ صلاح الدین لکھتے نہ تھے لیکن ہم سب لکھنے والوں کے نزدیک ان کی بے حد اہمیت تھی اور ان سے اپنی تخلیقات کی سند لینا بھی لازم۔" تو یہ چوہدری فضل حسین بھی کچھ ایسی ہی فکر انگیز اور دلپذیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے کنجاہی صاحب کی طرح مستقل ممبر تھے اور بورڈ کی ہر اہم میٹنگ میں ان سے ملاقات ایک خوشگوار واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک ساتھ آتے اور مجھ جیسے نوواردان کا ان سے ملنا اس لئے بھی مشکل ہوتا کہ کنجاہی صاحب کی طرح اپنی معتبر حیثیت اور اہم تر شخصیت ہونے کے حوالے کو ایک طرف رکھ کر ملتے۔ وہاں بھی اور گجرات اور ہر جگہ دیکھنے میں آیا کہ شریف کنجاہی صاحب ان کی رائے کو چاہے وہ کس قدر بھی اہم فکری، ادبی، تہذیبی اور تاریخی معاملہ ہوتا۔ اہمیت دیتے اور انہیں سند مانتے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چوہدری فضلِ حسین کی اپنی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ وہ شریف کنجاہی کو سرزمین گجرات ہی کے نہیں، معاصر عہد کے اس خطے میں اردو اور پنجابی کے معتبر ترین اور اہم ترین ادبی حوالے کے طور پر تسلیم کرتے اور اسی قدر عزت دیتے۔

چوہدری فضل حسین کی موت سے ان کے نزدیک زندگی کا اہم ترین باب اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ انہوں نے ان کے حوالے سے کئی سوگوار یادوں کو مجتمع کیا۔ کہ ان کے ساتھ تعلق کا سلسلہ پچھلے ساٹھ سال پر محیط تھا۔ تب سے جب ۱۹۴۵ء میں زمیندار کالج میں تاج محمد خیال نے ایک انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ حفیظ جالندھری راولپنڈی جاتے ہوئے کنجاہ پہنچے اور وہاں سکول کے ہیڈ ماسٹر احسان الحق سلیمانی سے کہہ کر کنجاہی صاحب کو چھٹی دلائی اور زمیندار کالج کے پرنسپل تاج محمد خیال کی رہائش گاہ پر پہنچے اور وہاں تفصیلی تعارف کروایا کنجاہی صاحب کا۔۔۔۔ مشاعرہ ہوا۔ تو بعد میں سب کو چھوڑ کر فضلِ حسین میرے پاس آئے۔ میں ہوسٹل میں رہتا ہوں اور کبھی وقت نکال کر ضرور تشریف لائیں۔ کنجاہی صاحب اپنی ان سے پہلی ملاقات کو یاد کرتے ہیں۔ یوں فضل حسین سے ان کے تعلق کا آغاز ہوا جو ان کی موت کے بعد بھی جاری ہے کہ وہ ہمیشہ ان کی یادوں میں، ان کی باتوں میں خوشبو کی طرح مہکتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر باقر کی بلاشیری پر فضل حسین کو اورینٹل کالج میں فارسی میں داخلہ ملا۔ ۱۹۵۱ء میں جب شریف کنجاہی صاحب خود اسلامیہ ہائی سکول شادیوال میں استاد تھے، فضل حسین زمیندار کالج گجرات میں استاد شعبۂ فارسی کے عہدے پر تعینات ہو چکے تھے۔ شریف کنجاہی صاحب فضل حسین کو ایک انسانیت پسند اور انسانی قدروں پر

یقینِ کامل رکھنے والے انسان کے طور پر جانتے تھے۔ ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''انہوں نے کالج کے مسکین ملازمین کے لئے رہائشی سکیم تیار کی۔ ایم اے کی کلاسز جاری کیں۔ مسجد کی ویرانی دور کی اور کالج کو صحیح معنوں میں ایک عظیم درس گاہ کے طور پر پورے ملک میں شہرت دلائی۔ وہ اپنے اعلیٰ اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہ کرتے تھے۔''

اور شاید یہی ان کی کامیابی کا راز بھی تھا اور کنجاہی صاحب سے طویل ترین تعلق کی بنیادی کلید بھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ شریف کنجاہی صاحب نے اپنے کئی نامور دوستوں' محبوب اور پیارے لوگوں کے بچھڑنے کے سانحوں میں فضل حسین کی موت کو سب سے بڑا سانحہ قرار دیا ہے تو درست ہوگا۔ شاید ان کے ہمدم دیرینہ اور علم اور فکر کے باب میں ان کے سب سے بڑے رازدار انہیں داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ اسی لئے تو انہوں نے کہا:

A friend better than thousand brothers.

وطن اور وطنیت' کنجاھی صاحب کی نظر میں

یوں تو محبتیں' تعلقات اور تعلق کی ڈوری کو سرے چڑھانا پنجاب کے کلچر کا حصہ رہا ہے لیکن شریف کنجاہی کے نزدیک اس روایت کو جاری و ساری رکھنا اس لئے بھی لازم تھا کہ وہ خواب پورے ہو سکیں جوان رشتوں' ان بندھنوں کا پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک وطن' ایک ملت کی تعمیر کی صورت میں سامنے لانے کی سعی کی گئی تھی۔ خود کنجاہی صاحب کا ترقی پسندانہ نظریات سے تعلق اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ اپنے دیس کے لوگوں کی تقدیر بدلنے کے خواہش مند ہیں اور ادب کو صریحاً عوامی امنگوں کا ترجمان ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور زندگی کو تبدیل کرنے کا آلہ بھی۔ اور اس آلے سے وجود میں آنے والی نئی ملت کو علامہ اقبال کی اس سوچ کے عین مطابق بنانا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں اقبال سوسائٹی میں ایک طرح سوشیو اکنامک سٹرکچر چاہتے تھے۔ اور ''جاوید نامہ'' میں جس ''مرغدین'' نامی آئیڈیل شہر کا پتہ انہوں نے دیا ہے اس کے عین مطابق پاکستان بھی ان کے لئے ایسا ہی ایک مثالی شہر تھا کنجاہی صاحب کے خیال میں:۔

> ''اس میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جب آپ کو کوئی مثالی شہر تعمیر کرنا ہو یا آپ کے ذہن میں کوئی ایسا آئیڈیل ہو تو اس میں' جن لوگوں کے پاس کچھ ہے' ان لوگوں کو وہ چیز قربان کرنا پڑتی ہے۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہے' ان کے لئے قربانی دینا پڑتی ہے' یہ اپنے طور پر بڑا مسئلہ تھا۔۔۔''

چونکہ کنجاہی صاحب کے پاس بھی کچھ آدرش تھے' کچھ خواہشیں تھیں اور کچھ خواب تھے اور اس صبح کی آرزو تھی جس کی تلاش میں یہ قافلے کے ہمراہ چلے تھے' ایک نئی منزل کی جانب سفر کا آغاز کیا تھا۔ سو اس منزل پر پہنچ کر امید تھی کہ وہ محرومیاں' وہ مایوسیاں دور ہو جائیں گی جو اس خطے کے گرے پڑے عوام کا مقدر ہو کر رہ گئی ہیں اور کنجاہی صاحب کے پاس تو صرف لوگوں تک ہی نہیں' ان کی

تہذیب' ان کے کلچر' ان کے تمدن' زبان اور معاشرت کا مسئلہ بھی تھا۔۔۔۔اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے جدوجہد جو کی اس میں بھی ایک معیار' ایک وقار ملحوظ رکھا۔ اگرچہ ان کے یہاں بیک وقت امید بھی ہے اور ناامیدی کا ہلکا سا رنگ بھی۔ تاہم ان کی فکر میں ایک مستقل روشنی اور نور کا حوالہ ہمیشہ ضوفشاں رہا۔ اور ان کا یہ کہنا کہ پاکستان کو علامہ اقبال سے منسوب کرتے وقت ہمیں اس کو "مرغدین" کے قریب ضرور لے جانا چاہئے تھا۔ لیکن پاکستان کی صورت وہ نہیں' اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان علامہ اقبال کا خواب تو ضرور تھا لیکن اس کی تعبیر میں گڑبڑ ہو گئی۔ یہ ایک ایسے تخلیق کار کا نقطۂ نظر ہے جو اپنے مزاج میں دھیمے پن اور فکر و نظر میں نہایت واضح اور شفاف ہے اور شریف کنجاہی کی اپنی زندگی کی جو تصویر تھی اس کا نہایت جامع اور بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔ ان سے انٹرویو کی کتاب "ویرتوں کنجاہ دا ایں" کے بیک فلیپ پر شفقت تنویر مرزا نے اور میرے خیال میں شریف کنجاہی صاحب کے ادبی سفر کو سمجھنے' اسے جاننے کے لئے اس تحریر کا مطالعہ ازحد لازم ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> "کیونکہ شریف کنجاہی جیسے ادیب ایک طرف ترقی پسندی سے یارانہ گاڑے بیٹھے تھے اور دوسری طرف ان جھونپڑیوں کے اردگرد آباد ہوئے تھے جن کو گھروں میں تبدیل کرنے کی خواہش ترقی پسندی کا ہی حصہ تھی۔"

شریف کنجاہی کو جھونپڑی کا خیال پہلے آیا اور انہوں نے لٹریری سٹیٹس کا خیال کئے بغیر ہی جھونپڑی کا رخ کر لیا۔ اس کام کے لئے انہیں غنیمت کنجاہی کی طرح تنبوڑی کا ڈنک نہیں مروانا پڑا۔ کنجاہی صاحب نفسیاتی حوالے سے لوگوں کی محرومیوں کا حال بھی بیان کرتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے پنجابی مسلمانوں کی پنجابی زبان کے بارے میں نفسیاتی طور پر مریضانہ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے خود ہی اس طرف رخ کر لیا۔۔۔۔اور شروع میں انہیں چاہے جن بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' آخر میں وہ پنجابی زبان اور ادب کا نور مینارہ بن گئے۔ ڈھول ڈھمکے اور شاموں صبحوں کے منائے بغیر۔۔۔۔اور آج ہم اس پر امن' سادہ اور دھیمے شخص کے بارے میں حکمت اور دانائی کی ان باتوں سے واقف ہوئے ہیں جو خالد ہمایوں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے کہلوائی ہیں۔۔۔۔آخر میں مرزا صاحب نے شریف کنجاہی صاحب کے اس شعر کے عین مطابق ان کی شخصیت کو قرار دیا:-

اچن چیت کوئی چنگیاڑا اپنا آپ وکھاندا

گلم گلی لکڑی تائیں آن مشال بناندا

اور یہ مشال جب جگی ہے جب جلی ہے تو اس نے اپنے وجود کی روشنی سے ایک پورے عہد اور اس عہد کے لوگوں کو روشنی عطا کی ہے اور ان موضوعات کو اپنی شاعری اور اپنی فکر کا موضوع بنایا ہے جن کو زیادہ تر بزعم خویش اپنے آپ کو بڑا شاعر ادیب سمجھنے والے درخور اعتنا نہیں جانتے تھے۔ یوں معمولی سمجھ کر نظر انداز کئے جانے والے موضوعات شریف کنجاہی کے یہاں اپنی تخلیقی بلندی پر نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ نظر انداز ہونے والے نظریات اصلاً ان نظر انداز کئے جانے والے لوگوں' ان زندگیوں اور ان کی زندگی کی ضرورتوں سے جڑے ہوئے تھے۔ فرق صرف اور صرف اپنی فکر کی شناخت کا تھا اور کنجاہی صاحب نے اپنے آپ کو جن لوگوں کے ساتھ شناخت کیا۔ اپنے آپ کو کھڑا بھی انہی لوگوں کے ساتھ کیا۔ اور دیکھا جائے تو اس سفر میں شریف کنجاہی صاحب تنہا نہیں تھے۔ انسان' انسان سے جڑے ہوئے رشتے ناتے' گھر' ماحول' گلی' شہر اور وطن سے بھی آگے انسانیت کی بقا کا مسئلہ تھا ان لوگوں کے سامنے اور یہ عجیب و غریب لوگ ایک عجیب و غریب دنیا آباد کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اور اس خواب کو انہوں نے ایک عملی صورت دی' ایک گاؤں آباد کیا اور یہ گاؤں درحقیقت ایک ماڈل تھا' ایک عالمی شہر کا ماڈل اور اس کا نام رکھا تھا انہوں نے ''پریت نگر''۔

پریت نگر۔ ایک خواب یا حقیقت

وہ ''مرغدین'' شہر جو کنجاہی صاحب نے اقبال کے ''جاوید نامہ'' سے اپنی زندگی میں اور زندگی سے بڑھ کر نظریئے میں بسا لیا تھا' درحقیقت اس کا وجود تشکیل پایا تھا ''پریت نگر'' کی صورت میں۔ چونکہ حقیقت یہ تھی کہ کنجاہی صاحب نے ''پریت لڑی'' میں لکھنا شروع کیا تھا۔ تو یہ پریت کا لفظ کئی دیگر لکھنے والوں کی طرح ان کے لاشعور میں بھی بس چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے ایک شہر ہی آباد کر لیا تھا۔ پریت نگر' اور اگر دیکھا جائے تو اس شہر کے آباد کرنے کے پیچھے کارفرما مقاصد ان کے آئندہ تخلیق ہونے والے ادب اور شاعری میں موجود رہے۔ اور وہ ہمیشہ اس کوشش' اس سعی میں مصروف نظر آئے کہ پورے دنیا کے انسانوں کے لئے ایسا ہی عظیم شہر آباد کرنا چاہئے۔ اور یہ پریت نگر کیا تھا اور اس کی حقیقت کیا تھی' شریف کنجاہی صاحب اس بارے میں بتاتے ہیں:۔

''واہگہ کے اس پار ایک چھوٹا سا اسٹیشن آتا ہے' اٹاری'' جہاں اتر کر کچھ
میل تک اندر جایا کرتے تھے۔ وہاں ایک قصبہ تھا جس کا نام ''پریت نگر''
تھا۔ یہ بستی دراصل سردار گوربخش سنگھ کی سوچ کا نتیجہ تھا۔ رسالہ ''پریت
لڑی'' پہلے ماڈل ٹاؤن لاہور سے شروع ہوا تھا۔ چونکہ یہ سوشلسٹ
نظریات کا حامل تھا' اس لئے میرا ان سے تعارف ہوگیا۔ سردار صاحب
امریکہ میں انجینئر رہے تھے اور وہاں سے ایک خاص سیاسی اور معاشی فکر
لے کر آئے تھے۔ وہ سیاست سے بڑھ کر سماجی اصلاح کا تصور رکھتے
تھے۔ ان کے نزدیک آزاد خیالی بڑی شے تھے۔''

اور یہی آزاد خیالی اور آزادہ روی کا نظریہ تھا جس نے لوگوں کے سامراج کے خلاف اور غلامی اور غلامی کے تصور سے نجات کے نظریئے کو جلا بخشی اور انتہا پسندانہ نظریات سے سوچنے والوں کو نجات بخشی۔۔۔۔۔

تو یہ سردار گوربخش سنگھ ہی تھے جنہوں نے وہاں زمین خریدی' تاریخ میں اس خطۂ زمین کے بارے میں عجیب وغریب روایات مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ زمین آسیب کا مسکن ہے اور ظاہری بات ہے کہ جو جگہ آسیب کا مسکن تھی اسے رہنے کے قابل بنانے کے لئے لازمی تھا کہ وہاں انسانوں کو آباد کیا جاتا اور وہاں انسانی قدروں کو فروغ دیا جاتا۔۔۔۔۔ یوں سردار گوربخش سنگھ نے وہاں ایک کالونی بنادی اور شریف کنجاہی کے نزدیک:

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کریڈٹ سردار گوربخش سنگھ کو جاتا ہے کہ دنیا میں وہ واحد
بستی تھی جہاں انہوں نے یہ عجیب وغریب صورت حال پیدا کردی کہ جو نہ
کبھی پہلے ہوئی اور نہ بعد میں۔ کہ وہاں ایک مشترکہ (Mess) میس
تھا۔ سبھی لوگ ایک جگہ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ ہر گھر کی یہ ڈیوٹی ہوا کرتی تھی
کہ آج اسے میس چلانا ہے۔ بہر حال یہ ایک مثالی ماحول بنانے کی کوشش
تھی' سالانہ اجتماع بھی ہوا کرتا تھا' ہم خیال لوگ بھی جمع ہوا کرتے تھے۔
میں بھی تقریباً ہر سال وہاں جایا کرتا تھا' امرتا پریتم بھی آتی تھیں' دوسرے
شاعر ادیب بھی آتے تھے۔''

تو اس ماحول کے پروردہ تھے شریف کنجاہی اور ان کے معاصرین۔ اس ماحول نے ان کی

پرورش کی تھی۔ اخوت اور بھائی چارے کے اس عمل کو مشن بنانا چاہتے تھے یہ لوگ۔ اور یہی مشن اصلِ حیات اور عینِ حیات بھی تھا۔ اور یہی مشن شریف کنجاہی صاحب کی زندگی کا مشن بھی رہا۔ اگرچہ وہ اس قدر حقیقت پسند اور سچائی سے ہمکنار رہنے والے انسان ہیں اور بہت سے ہم فکر لوگوں کی بہ نسبت وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ''انسانی مسائل کا حل شاید کوئی نہیں اور یہ تجربہ ہزاروں سال کے تجربات کے بعد بے سود ہی رہا ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے مسائل کا حل سوشلزم میں ہے۔۔۔۔'' لیکن وہ یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ انسانوں کو مسائل میں گھری ہوئی زندگی میں آسودہ حالات ضرور فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ اور وہ شاید ایسی صورت حال اس لئے ممکن قرار دیتے ہیں کہ وہ شاعری کو شعوری عمل قرار نہیں دیتے بلکہ ابہام سے قریب قریب رہنے والی صورت حال خیال کرتے ہیں۔ سوان الہامی کیفیات کا انسانی صورتِ حال پر جس قدر اطلاق ہو سکتا ہے وہ اسے اتنا ہی بہتر بھی سمجھتے ہیں اور سودمند بھی۔۔۔۔!!

عشق اور تخلیق عشق کا تصور

اگر یہ کہا جائے کہ کلاسیکی اور صوفی شعراء کے نزدیک عشق کا جو تصور موجود تھا اور اس کے جو مابعد الطبیعاتی اثرات تھے۔ اور سماجی سطح پر اس کے جو اثرات تھے انہیں شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر جب بھی موضوع بنایا گیا' اس کے ہمیشہ مثبت نتائج ظاہر ہوئے۔ اور انہی اثرات کا مظہر تھا وہ ادب جس کی تخلیق ۴۰ء کی دہائی سے شروع ہوئی اور جو کم وبیش آج تک ہمارے ادب میں بہت حد تک کارفرما ہے۔ شریف کنجاہی صاحب کے یہاں تخلیقی منظرنامہ اسی عشق کی لو سے منور ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو انسانی زندگی کی داخلی کیفیات کی باریک اور ریشمی تاروں کو چھوتی ہے۔ لیکن اس میں جو باریکیاں کارفرما ہیں ان کو سمجھنا اور تجربہ کرنا آسان نہیں۔ یہ تصوف کا وہ مرحلہ ہے جسے محض اور محض صوفی ہی تجربہ کر سکتا ہے۔۔۔۔ لیکن ایک سطح پر جو لفظ ہم استعمال کرتے ہیں' جو اصطلاحات ہم برتتے ہیں' وہ ہمارے اندر کی تبدیلی کا سبب بنتی ہیں۔ غرض دنیا پر ہر انسانی عمل ایک کیفیت' ایک تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔ شریف کنجاہی صاحب کے نزدیک حسن کا اور عشق کا یہ تصور ان لفظوں میں بیان ہوتا ہے:۔

> ''حسن ایک ایسا لفظ ہے جو ہمارے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے جو ہم چاہتے ہیں کہ برقرار رہے۔ جس کیفیت کو ہم برقرار رکھنا چاہتے ہیں اسے ہم (Repeat) کرتے ہیں جسے ہم برقرار نہیں رکھنا چاہتے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ عشق اس حسن کی طلب کا نام ہے' وہ حسن کیا ہے؟ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے' ہم اسے ڈیفائن نہیں کر سکتے لیکن وہ موجود تو ہے۔ یہ لفظ ایک سمبل بن گیا ہے مثلاً جب ہم یہ لفظ ''حسن'' بولتے ہیں تو ہمارے سامنے فوری طور پر کوئی تصویر نہیں آتی لیکن ہمارے اندر یہ لفظ ایک

کیفیت ضرور پیدا کرتا ہے۔ وہی کیفیت ہمارے لئے اہم ہوتی ہے' ہم چاہتے ہیں کہ وہ کیفیت برقرار رہے۔ اس حسن کے لئے ہمیں کوئی حسین چاہئے ہے۔ تا کہ اس حوالے سے وہ کیفیت (Materialise) ہو جائے۔ عشق جو لفظ ہے اس کے میرے نزدیک لفظی معنی جو بھی ہوں یہ حسن کے حصول کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ لفظ ایک کنجی ہے' اس لئے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے۔۔۔۔''

اس کوشش' اس جستجو' اس آرزو میں ایک فریب' ایک گمان ہے۔ جو آگے چل کر تخلیق کا سبب بنتا ہے اور یہ سب کچھ اس حسن کی طلب کا معاملہ ہے جو بعد ازاں معاملۂ دل بن جاتا ہے۔ یہ سارا دراصل جستجو کا مسئلہ ہے وہ جستجو جو دل سے جڑی ہے۔ دل جو حسن کی تلاش میں ہے اور جس کا بنیادی محرک عشق بنتا ہے اور یہی عشق ہے جو صوفیاء کی زندگی کا بنیادی استعارہ نظر آتا ہے اور اسکی طلب کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اور شریف کنجاہی کے نزدیک عشق کا یہ تجربہ درحقیقت صوفیاء کے نزدیک بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کے کچھ حصے کچھ اجزاء ہمارے وجود کا حصہ بن جاتے ہیں۔ شریف کنجاہی صاحب کہتے ہیں:۔

''طلب کبھی ختم نہیں ہوتی' باقی جو کچھ ہے اسے زوال ہے' انحطاط ہے' تغیر ہے۔۔۔۔۔ اسی لیے' اس مجاز کی طرف سے جو صوفیاء تھے اس حقیقی کی طرف لے چلے کہ مجازی تو ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔۔۔۔۔ پھر یہ ان کی داخلی کیفیت ہے جس کا مجھے اور آپ کو میرا خیال ہے تجربہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔''

اور اگر یہ کہا جائے کہ شریف کنجاہی صاحب کی ذات میں جو قناعت' جو انکساری اور جو عجز موجود ہے وہ انانیت کو ختم کیے بغیر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اور پھر ان کی شاعری میں وہ جملہ عناصر موجود ہیں جو انہیں زندگی کی اس فلاسفی سے قریب تر کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی ابتدائی دنوں کی ایک غزل دیکھیے جو عشق کے اس رنگ میں رنگی نظر آتی ہے:۔

''جدوں کدی وی تیرا خیال آیا' نال ہور وی بڑے خیال آئے
مرزے جنڈیاں بیٹھ میں کئی ویکھے' بیلے وچ نظر مہینوال آئے

تیرے شوق چ کھنب کھوہا کے تے اساں آپ ای قید قبول کیتی

ہن توں اوہناں نوں کیہ ازاد کرنا' جیہڑے آ بلنے اپنے بال آئے

اساں ای آن کے ایس بازار اندر سودے ڈگ کے دلاں دے نہیں کیتے

لوکی بلخ بخاریوں ٹر کے تے انجے مڈھ توں ویچدے مال آئے

پلکاں لمیاں گوڑھیاں نیویاں دی تک تک کے چھاں شریف رجھے

ایس چھاں نوں اوہ نہیں مان سکے جیہڑے وچ بیلے عمراں گال آئے

یہ غزل ان کے عشق کے صوفیانہ تجربے کی ہی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اس میں زندگی کے بارے میں اس انسانی رویے کی جھلک بھی ملتی ہے جو آگے جا کر جدید پنجابی کے شعری اور نثری ادب کی بنیاد ٹھہرا اور شریف کنجاہی صاحب جو اس رویے کے حامل تخلیق کاروں میں شامل تھے جدید پنجابی ادبیات کے معماروں میں شمار ہوئے۔

زندگی اور زندگی سے جُڑے رویے

شریف کنجاہی صاحب نے اپنی زندگی میں ترقی پسندانہ رویوں اور رجحانات کے در آنے' نشو ونما اور فروغ پانے کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے' وہ لکھتے ہیں:۔

''میں جب کالج میں پڑھتا تھا تو علی عباس جلالپوری میرے کلاس فیلو تھے۔اس دور میں نیاز فتح پوری پر کفر کا فتویٰ لگا تھا کہ اس کے خیالات اچھے نہیں ہیں' یہ کافر ہے۔ہم دونوں نے سوچا کہ دیکھیں تو سہی کہ حقیقت کیا ہے۔ہم نے کالج سے وہ رسالہ حاصل کیا جو لکھنو سے ماہوار نکلتا تھا۔ہم اسے پڑھنے کے بعد اس کے گرویدہ ہو گئے۔اور ہم دونوں بھی اس رنگ میں رنگ گئے۔یوں حقیقت سے قربت اور زندگی کے یہ رویے اور ان کے اثرات ہمارے اندر نیاز فتح پوری کی تحریروں کے سبب پیدا ہوئے۔اس کے بعد برٹرینڈ رسل میرے مطالعہ میں آیا۔۔۔۔لاہور کے ایک صاحب جن کا پبلشنگ کا ایک ادارہ تھا انہوں نے مجھے تحریک دی کہ میں رسل کی کتاب (Road to Freedom) کا ترجمہ کر دوں۔اس طرح ''آزادی کی راہ میں'' کے عنوان سے اس کتاب کا ترجمہ بھی کیا۔جو چھپا بھی۔۔۔۔۔دراصل جب میں نے رسل کو پڑھا تو میری سوچ کی بے راہ روی میں سے ایک راستہ نکل آیا۔رسل نے مجھے بتایا کہ جنگ بری چیز ہے اور زندگی میں معاشی انصاف ہونا چاہئے۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ دونوں چیزیں میری سوچ کا بنیادی حصہ بن گئیں۔پھر میں روسی مصنف کروپاگن سے متاثر ہوا۔میں نے (Conquest of Bread) کے ہندی

ترجے کو سامنے رکھ کر چند ابواب کو ''آزاد سماج'' کے نام سے چھپوایا۔ اس طریقے سے کرپاٹکن سے متاثر ہوا۔ پھر رسل کی دوسری کتابیں بھی میں نے پڑھیں جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں واحد شخص ہوں جس نے رسل کے فوت ہونے پر فارسی میں اس کا مرثیہ لکھا۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اچھی سوچ رکھنے والے انسانوں کی طرح شریف کنجاہی صاحب اچھے دنوں کی تلاش میں رہے۔ اور سفر اور تجربے کے ساتھ ساتھ زندگی کی کامل سچائیوں کی طرف رجوع کرتے چلے گئے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ''شاعری کا کام ایکسرے کرنا ہے' ایکسرے کو دیکھ کر علاج کرنا شاعر کا کام نہیں ہوتا'' پھر بھی وہ امید رکھتے ہیں کہ زندگی میں وہ دن ضرور آئے تا کہ ہم اس انقلاب کو دیکھ سکیں۔

اس ساری صورت حال میں وہ فنونِ لطیفہ کو واحد ذریعہ سمجھتے ہیں جو اگر معاشرے سے خارج ہو جائے تو انسان کے اندر داخلی بے چینیوں کا در کھل جائے گا۔ کہ دنیا میں جتنے بھی فنکار شاعر' ادیب نظر آتے ہیں جو احساسات و جذبات کو قلم یا برش کے ذریعے سامنے لاتے ہیں وہ تمام ایک داخلی دکھ اور بے اطمینانی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اسے انہوں نے اپنے ماحول اور زمین کا خاصا بھی قرار دیا ہے۔ اپنے فنی سفر کے حوالے سے وہ بات کرتے ہوئے بتاتے ہیں:۔

''رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہوا کہ جس علاقے کی مہک مجھ میں ہے' وہ مہک میری اردو شاعری میں نہیں آ پائی۔ اس احساس کے ساتھ میں اردو سے دُور ہوتا گیا اور پنجابی کی طرف زیادہ مائل ہوتا گیا۔ ہر زبان کی ایک فکری اور جذباتی فضا ہوتی ہے۔ وہ لکھنے والے پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ اردو شاعری کی جذباتی اور فکری فضا پنجابی کی جذباتی فضا سے مختلف ہے۔ پنجابی کی فضا نہ صرف اردو سے بلکہ فارسی کی فکری فضا سے بھی مختلف ہے۔ یہاں تک کہ پنجابی کا صوفی شاعر بھی فارسی کے صوفی شاعر سے مختلف ہے۔''

کئی ایک معاملات ہوتے ہیں جو انسان کی شعری اور فکری نشو ونما میں حصہ لیتے ہیں۔ شریف کنجاہی صاحب کے یہاں اپنے فکری اور شعری عملی رویوں کے پسِ پردہ کئی ایک عوامل کارفرما ہیں جن میں سے ایک ان کی اپنی ذات کی تنہائی ہے۔ جسے درحقیقی وہ انفرادی معاملہ یا مسئلہ قرار نہیں

دیتے۔ اس سے بھی وہ ایک اجتماعی فکر کشید کرتے ہیں اور اپنی اس تنہائی کہ وہ گھر میں اکیلے بیٹے تھے اور وہ اپنی بہنوں کے ساتھ رہتے ہوئے اس انسانی رویے کو فروغ دے رہے تھے جو بعد ازاں ان کی شخصیت کا جزوِ لازم بن گیا۔ البتہ ان کے یہاں ایک سماج اور اک کلچر میں رہتے ہوئے بچھڑ جانا ان سے جدا ہو جانا ایک نئے اور منفرد تجربے کا حامل تھا۔ جو آج تک ان کی یادوں میں مہکتا ہے۔ اور اس بچھڑنے کو بھی انہوں نے مختلف نوعیتوں کے حامل تجربات پر منطبق کیا ہے۔

''ایک بچھڑنا انفرادی ہوتا ہے' اس فراق میں بھی وصال کی امید ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ مجھے پارٹیشن کے بعد ہوا۔ بہت سے ہندو دوست بچھڑ گئے' رابطے بھی کٹ گئے۔''

شریف کنجاہی صاحب کے لفظوں میں:

میں نے اس جدائی کو محسوس بھی کیا اور اس پر لکھا بھی۔ دوسری صورت موت ہے۔ میرے لئے پہلا تجربہ والد صاحب کی موت تھی جس کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ دوسرا میرا جواں سال خوبرو بھانجا تھا' مظہر۔ جس نے مدتوں نڈھال رکھا۔ والدہ اور بیوی کی موت کو میں نے ان کے لئے بہتر جانا کہ وہ طویل علالت کے بعد فوت ہوئیں۔ میں جس وقت محسوس کرتا ہوں کہ میں کسی غم کے پھندے میں پھنسنے والا ہوں' میں کہیں نہ کہیں نکل جاتا ہوں۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ پارٹیشن کا یہ تجربہ بعد میں ان کے یہاں ایک بھرپور تخلیقی تجربہ بن کر محفوظ ہوا۔ اور جو ابھی تک ان کی یادوں میں روشن ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یادوں کی اس گہرائی اور گیرائی کو محسوس کرنے کے لیے بے حد اہمیت کا حامل ہوگا۔ کنجاہ کی نائر فیملی قابلِ ذکر فیملی ہے' جس کے ایک اہم فرد جے چند نائر تھے' جو شریف کنجاہی صاحب کے بہت بچپن کے اور قریبی دوست تھے۔ اس فیملی کے دو' بہن بھائی جو گاندھی کے بڑے شیدائی تھے۔ پیارے لال اور شیلا نائر۔ گاندھی جی ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ گجرات آئے تو دونوں بہن بھائیوں نے ان کے جلسے میں شرکت کی۔ یہ لوگ جاگیر دار تھے۔ اس لیے ان کو اپنے بچوں کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ لیکن انہوں نے گھر والوں سے کہا کہ ہم مستقل طور پر گاندھی جی کے ساتھ دہلی جا رہے ہیں اور آج کے بعد ہم کنجاہ نہیں آئیں گے۔ پھر پیارے لال نے گاندھی جی کے ساتھ اتنا رابطہ اور تعلق بنایا کہ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری بن گئے۔ اسی طرح بہن بھی پہلے ڈاکٹر اور پھر سیاست میں آکر دہلی میں سنٹر گورنمنٹ کی وزیر بن گئیں۔ یہ لوگ یقیناً پھر کبھی کنجاہ واپس نہیں آئے۔ لیکن یہ بھی کنجاہی صاحب کی

یادوں سے جڑا ایک ایسا واقعہ ہے جو اس بچھڑنے کی معنویت کو ابھارتا ہے جس کی بات وہ اکثر کرتے ہیں۔

یاد رہے کہ یہ وہی ڈاکٹر شیلا نائر تھیں جن کی وفات کے بعد جے چند نائر نے دہلی سے ۱۴ مئی ۲۰۰۱ء کو کنجاہی صاحب کو ان کی (استیاں اجم کی راکھ) کنجاہ کے قریب سے گزرنے والی نہر میں بہانے کی وصیت کی تھی۔ جسے اس کی آخری خواہش جانتے ہوئے شیلا کی راکھ کو نہر اپر جہلم میں بہانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اسے محض مٹی کی محبت ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

کنجاہ میں کریانے کی دکان کھولنے سے لے کر اپنی یادوں پر مشتمل تصنیف ''ساہواں دا ویزہ'' تحریر کرنے تک ایک طویل سلسلہ ہے یادوں کا۔ جسے اپنی سانسوں کا قرض سمجھتے ہوئے شریف کنجاہی صاحب ادا کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ وہ شعر و حکمت، فلسفہ و طب، تصنیف و ترجمہ سے دلچسپی کی بات تو کرتے ہیں۔ ایک دو جگہوں پر انہوں نے علمِ نجوم اور پامسٹری سے اپنی لگن کو بیان کیا ہے۔ تو دیکھتے ہیں کہ ان کی ان علوم سے دلچسپی کس حد تک ہے۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا

'میں ستاروں کو انسانی زندگی میں داخل ہونے کے بارے میں کوئی واضح نظریہ نہیں رکھتا اور نہ میں نے اس کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے' اس لئے میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

یہ نہایت حقیقت پسندانہ رویہ ہے جو کنجاہی صاحب نے روا رکھا ہے لیکن وہ کتاب جو قدیم ایام میں فارسی ادبیات میں اہم سمجھی جاتی تھی اور جس کے مطالعہ سے ستاروں کا احوال جانا جاتا تھا ''چہار مقالہ'' کنجاہی صاحب بھی اس کو مستند تصور کرتے ہیں۔ اور اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ بعض بادشاہوں کی پیدائش کے وقت دو سعد ستارے ایک برج میں اکٹھے ہو جاتے تھے اور بعد میں انہی لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آفرین تبدیلیاں دیکھ کر اس کتاب اور اس کتاب میں موجود علم پر اپنا یقین پختہ کر لیتے ہیں۔ جب کہ ایک طرف انہوں نے اس نظریئے کی تائید کی ہے تو دوسری طرف اقبالؒ اور غالب کے ان اشعار کو بھی بطور مثال پیش کیا ہے جس میں وہ اس نقطۂ نظر کو خام تصور کرتے ہیں:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
جو فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

اقبال

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

اقبال

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

غالب

اگر چہ وہ اس عمل کو تشکیک کا عمل قرار نہیں دیتے اور اس عرصۂ تشکیک میں سے گزرتے ہوئے اپنی کامیابی کو اپنا شعوری عمل قرار دیتے ہیں جبکہ دوسری طرف وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ جو سورۂ عصر میں آیا ہے ''ان الانسان لافی خسر'' تو اس طرف بھی رجوع کرنا چاہیے'' میں نے اس طرف دھیان دیا تو مجھ پر کتنے ہی عقدے وا ہو گئے۔ میں نے اس سے زندگی کے کچھ راستے چھوڑ دیئے اور کئی نئے منتخب کر لئے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ اپنی طویل عمر اور اچھی صحت کے حوالے سے کہتے ہیں:

''میں کئی برس سے بیمار چلا آیا۔ پھر اچانک ٹھیک ہو گیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں نے اس کا اندازہ لگایا ہے کہ میرے ہاتھ پر ایک جزیرہ بنا ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میں کرائسس میں مبتلا ہوں۔ لیکن جب یہ لکیر آگے نکلی ہے تو ٹھیک ہو گیا ہوں۔ میرے نزدیک پامسٹری ٹھیک سا علم ہے' میں نے اس عرصے میں کوئی خاص دوائی نہیں کھائی' کوئی علاج نہیں کیا' چار پانچ سال بیمار رہنے کے بعد ٹھیک ہو گیا ہوں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ پامسٹری ایسا علم ہے یا نہیں بعض باتوں میں' میں پامسٹری کو قابلِ اعتماد سمجھتا ہوں۔ اور میری صحت میں بھی مجھے کوئی دخل نہیں۔ میری صحت کی لکیر کو دخل ہے جو میں نے نہیں بنائی۔ میں کوئی خاص کھانا نہیں کھاتا۔ میں نے کیرو کی پامسٹری کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ میں اس کو کافی حد تک قابلِ اعتماد سمجھتا ہوں۔ میں نے بعض لوگوں کے ہاتھ دیکھے ہیں ایک پامسٹ کے طور پر نہیں۔ میرے دو دوست ہیں جن کے دل اور دماغ کی لکیریں ایک جیسی ہیں۔ میں نے ان کو ایک سے مزاج کا

دیکھا ہے۔ میرے دونوں دوست علیحدہ علیحدہ رہنے کے باوجود ایک جیسا مزاج رکھتے ہیں۔ اس طرح ہاتھ پر زہرہ کا ابھار ہوتا ہے۔ اس میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔"

ان تمام مثالوں' واقعات اور روایات کو بیان کرنے کا ایک بڑا مقصد تو یہی ہے کہ وہ سب جو شریف کنجاہی صاحب کی شاعری' شخصیت اور ان کے فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے سامنے ان کی زندگی کے مختلف رویوں' رجحانات اور دلچسپیوں کو لایا جائے۔ تاکہ ان کے فن ان کی تخلیقات میں جو زندگی کے بھرپور رنگ ہیں' ان سے مکمل آگہی اور ادراک حاصل ہو سکے۔ اور یہ احساس کہ کنجاہی صاحب کی ذات ماورائے فطرت معاملات کی حامل ہوگی' دور کیا جا سکے بلکہ یہ کہ وہ عام انسانوں ہی کی طرح رنج و راحت' خوشی و غم' دکھ سکھ اور علم و منطق کو دیکھتے ہیں' سوچتے ہیں اور اگر کوئی فرق ہے تو وہ ہے کہ وہ اس پر بیان کی بھرپور قدرت رکھتے ہیں اور صرف بیان کی حد تک ہی نہیں بلکہ ایک منفرد اسلوب اور مختلف زاویہ نظر کے حامل بھی ہیں۔

شریف کنجاہی صاحب جو نظریئے کو اور کلچر اور سیاست کو ادب کے اہم جزو تصور کرتے ہیں' دراصل ادب میں زندگی تخلیق کرنے کے نقطۂ نظر سے قریب تر ہو کر اسے دیکھنے' سمجھنے اور مقدور بھر اس پر عمل پیرا ہونے کی بات کرتے ہیں۔ وہ کلچر کو انسان کے رہنے کا ایک انداز سمجھتے ہیں اور سیاست کو نظریئے میں پختگی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام عناصر کو جو کلچر میں' جو سیاست میں اور جو زندگی کے ہر عمل میں کارفرما نظر آتے ہیں' ادب ہی کا بلیغ اظہار قرار دیتے ہیں۔ وہ فطرت سے اور فطرت سے قریب تر لوگوں کے روزمرہ سے اپنے فن کے لئے خام مواد حاصل کرتے ہیں۔۔۔۔ یہ تمام تر علوم ہیں جو انہوں نے زندگی' لوگوں' اپنے تجربات' مختلف تحریکوں' ادبی اور فکری انجمنوں سے اخذ کئے۔

حلقۂ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین اس میں شریک ہونے والے' لکھنے والے اور وہ جگہیں جہاں وہ بیٹھتے تھے' ان جگہوں کے ان کی زندگی پر بھی لامحالہ اثرات ہوئے ہوں گے۔ وہ اس حوالے سے بھی اپنی یادیں روشن کرتے ہیں۔ یہ یادیں بذات خود اہم ادبی' فکری' سماجی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ادبی انجمنیں

شریف کنجاہی صاحب اپنے ابتدائی دنوں میں زیرِ مطالعہ آنے والی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں تو لگتا ہے کہ ان کی تربیت میں ان اہم زعماء اور اداروں کا حصہ رہا ہے۔ جہاں ان کی زندگی کی تربیت شروع ہوئی۔ وہ زمیندار کالج گجرات کے تاج محمد خیال کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ان کو کتابوں کے انتخاب میں مدد دی' وہ اپنے شروع کے دنوں میں زیرِ مطالعہ آنے والی کتابوں میں مارکس کی ''سرمایہ'' کا ذکر کرتے ہیں۔ کمیونسٹ مینی فسٹو کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ قرآنِ حکیم کے گہرائی کے ساتھ مطالعہ کی بھی بات کرتے ہیں جو بعد میں پنج سورہ کے تراجم اور بالآخر قرآن حکیم کے مکمل پنجابی ترجمے کی صورت میں سامنے آیا۔ بہرطور یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت'' کنجاہی صاحب کی ذات میں علم و ادب اور فکر و عمل کا یہ پودا خوب نشو و نما پایا' خوب پھلا پھولا۔ اس میں کنجاہی صاحب دو اداروں کا ذکر کیے بغیر نہیں رہتے۔ ایک تو حلقۂ اربابِ ذوق اور دوسرا انجمن ترقی پسند مصنفین' وہ خود کو ایک متحرک ترقی پسند تو قرار نہیں دیتے بلکہ اپنے آپ کو گلابی سا ترقی پسند قرار دیتے ہیں۔ تاہم وہ ان اداروں اور ان اداروں سے منسلک لوگوں کا ذکر نہایت عزت و احترام سے کرتے ہیں۔

یوسف ظفر' ساحر لدھیانوی' وحید قریشی' حفیظ جالندھری' علی عباس جلالپوری اور دوسرے کئی اہم لوگ۔ ان کے خیال میں حلقہ اربابِ ذوق لاہور ایک ایسا ادارہ تھا جہاں بھرپور بحث مباحثہ ہوا کرتا تھا' پڑھے لکھے لوگ آتے تھے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ اربابِ ذوق میں جو بنیادی تفریق تھی وہ انجمن کی تخلیقات میں سیاسی نظریات اور کومٹمنٹ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا تھا۔ اب یہ تو نہیں کہ کوئی بھی لکھنے والا ان چیزوں سے دُور ہو' لیکن انجمن میں بعض سطحوں پر ایسا تشدد پسند رویہ غالب آ گیا تھا۔ جس نے بہت سے لوگوں کو اس سے دُور کر دیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کی صورت حال خالصتاً ادبی اور مختلف نوعیت کی تھی۔

لفظ سے محبت

سُر' لے' ردھم رنگ سے بھی بڑھ کر جو شے شعر کے لئے' شاعری کے لئے نہایت اہمیت کی حامل ہے وہ ہے زبان اور زبان کا استعمال۔ اور ظاہر ہے زبان کی تخلیق لفظ سے ہوتی ہے۔ ارسطو سے لانجائنس اور ورڈز ورتھ سے کالرج تک بھی زبان کے استعمال کے بارے میں ثقہ رائے رکھتے ہیں۔ شریف کنجاہی صاحب بذاتِ خود لفظوں اور زبان کے شعر اور ادب کے مقام کے سلسلے میں ان لوگوں کے ہم خیال نظر آتے ہیں اور جب کہ وہ خود اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں تو وہ بھی اس طرح کا ادب تخلیق کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دوسرے لکھنے والوں سے اور اپنی اردگرد کی ادبی صورت حال اردو اور خاص طور پر پنجابی ادب کی رفتار اور اس میں نقطۂ نظر کی اہمیت کو حتمی اور اہم سمجھتے ہیں۔ اگر چہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کے لئے کس قسم کی فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سیاسی اور سماجی طور پر موافق حالات معیاری ادب کی تخلیق ممکن بنا سکتے ہیں یا پھر ناموافق حالات عظیم اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کی ضمانت دے سکتے ہیں۔''

اگر چہ ان کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ یہ کہنا کہ کون سا دور' کون سا عہد اور کون سا زمانہ ادب کی تخلیق کے لئے سازگار اور مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر بھی جب وہ تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں تو انہیں اٹھارویں صدی میں بھرپور اور عوامی امنگوں کے عین مطابق ادب تخلیق ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس عہد میں پنجابی میں نثری ادب تخلیق کرنے کا

رجحان زیادہ نہیں تھا۔ تاہم اس عہد میں جو شعری ادب تخلیق ہوا اسے دنیا کے بڑے ادب کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے اور کسی حد تک یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس عظیم شعری ادب کے بطون میں ہی کہیں نثری ادب کا ایک عظیم اور گراں قدر خزانہ چھپا ہوا تھا۔ جس نے مستقبل میں پنجابی زبان و ادب کا دامن ادب کی نثری تشریحوں اور اس کے سیاق و سباق کے تحت بھرنا تھا۔ اور پھر کنجاہی صاحب کی اس بات کی بھی بھرپور تائید کی جا سکتی ہے کہ اس عہد میں ہونے والی شاعری میں بھی بہت کم نمونے ہیں اور بہت کم شعراء ہیں جو سامنے آ سکے۔ نہ جانے کتنے لوگ، کتنے لکھنے والے کتنے شاعر تھے جن کا کلام دستِ بردِ زمانہ ہو گیا۔ اس کی سادہ سی وجہ تو یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہر عہد میں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے ہر عہد میں، ہر زمانے میں۔ لیکن صرف وہی ادب اور وہی نام باقی رہ جاتے ہیں جن کی باتیں ہر زمانے، ہر عہد کے انسان کی ضرورت بن کر ان کے ذہن و شعور پر چھا جاتی ہیں۔ اس کے حوالے سے جو اہم اور عظیم نام نظر سامنے آتے ہیں ان میں بابا فریدؒ، شاہ حسینؒ، بلھے شاہؒ، وارث شاہؒ، میاں محمد بخشؒ اور خواجہ غلام فریدؒ کے ایسے نام ہیں جن کی ذات کے فیضان کا سرچشمہ ہی ہے اس کے بعد تخلیق ہونے والا ادب۔۔۔۔!

اور اگر ایک خاص عہد اور زمانے کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو جو نو کلاسیکی ادب سامنے آتا ہے جس میں انسانی زندگی کی پیچیدگیاں، الجھنیں اور گھمبیر مسائل ادیبوں، شاعروں کا موضوع بنے ہیں، اس عہد کے نمائندہ اور ترجمان ہیں، شریف کنجاہی صاحب اور ان کے معاصرین۔ شریف کنجاہی جن کی شاعری پر عشق کی پرچھائی گہری ہے، ان کا یہ عشق درحقیقت سماج سے منظور شدہ ہے جسے اقبال نے اصل حیات و ممات قرار دیا ہے۔ شریف کنجاہی کی ذات کے ارد گرد سرسراتا محسوس ہوتا ہے!!

مجموعی تاثر

یوں تو شریف کنجاہی کی علمی' ادبی' تخلیقی' تحقیقی و تنقیدی اور شعری خدمات کا احاطہ کرنے کے لئے بہت کچھ لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو ان پر بہت سا کام ہو بھی چکا ہے۔ لیکن ایک اور بات جو قابلِ ذکر ہے اس ضمن میں وہ یہ ہے کہ اردو اور پنجابی زبان و ادب میں کوئی ایسا دوسرا نام نظر نہیں آتا جس پر اس قدر کام اس کی زندگی میں ہوا۔ لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہو' ان پر علمی و ادبی رسائل و جرائد نکالے ہوں۔۔۔۔ شریف کنجاہی صاحب ان محدودے چند لکھنے والوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ہفت پہلو شخصیت کا ایک معیار' ایک اعتبار قائم کیا ہے۔ اور سب سے بڑھ اس معیار' اس اعتبار کو وہ جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔ اور ایک ادیب کا معاشرے میں جو کردار ہونا چاہئے وہ نہ صرف اس سے آگاہ نظر آتے ہیں بلکہ اس کردار کو بہت حد تک نباہا ہے انھوں نے۔۔۔۔ ایک طرف اگر وہ بطور ادیب معاشرے میں اپنے کردار سے آگاہ دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف ان کی جو سماجی اور معاشرتی ذمہ داری بنتی ہے وہ بھی نباہ رہے ہیں۔

ان کی شاعری میں رومانیت پرستی' ترقی پسندی' بغاوت اور انقلاب اور نفسیاتی عناصر کا امتزاج نظر آتی ہے تو دوسری طرف ''جھاتیاں'' اور دوسرے مضامین کی صورت میں ان کی فکر کے عناصر ضوفشاں نظر آتے ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے منتخب تراجم کی صورت میں دوسری زبانوں کے ادب سے ہم آشنا کر رہے ہیں تو دوسری طرف اپنی تحقیقی کتب' انٹرویوز اور خودنوشت کی صورت میں اپنی ذات' اپنے ہونے کے احساس کو زندہ و تابندہ رکھے ہوئے ہیں۔

جس طرح کہ بات کی گئی تھی' شریف کنجاہی کے نزدیک معاشرے میں ادیب کے کردار کی تو وہ خود اس کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''میرے نزدیک کسی ادیب کا معاشرے میں کردار اس کا ذاتی اظہار ہی ہوتا ہے' ایک ادیب ذاتی سطح پر اظہار خیال کرتا ہے۔ ادیبوں کی اقسام ہوتی ہیں ناں' ایک ادیب ہوتا ہے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ سماج میں کوئی تبدیلی ہو۔ وہ اسی بات پر خوش ہے کہ وہ لکھ رہا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ جو ہو رہا ہے وہ اچھا نہیں' یہ نہیں ہونا چاہئے۔ وہ اپنے خیالات اشعار میں بیان کرتا ہے۔ اگر کچھ لوگ اسے پسند کرتے ہیں تو یہ پسندیدگی اس کے لئے اکسیر ہو جاتی ہے۔۔۔۔ لیکن کچھ ادیب ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ شاید میری باتوں سے معاشرے کی اصلاح ہو جائے' وہ اسی طرف چل پڑتا ہے۔ یہ رویہ زیادہ رجحان پکڑ لیتا ہے' اس کے ساتھ ہی اس کا مقام متعین ہوتا ہے۔۔۔ ہم کسی شاعر یا ادیب پر پابندی عاید نہیں کر سکتے کہ وہ لازماً اسی طرف چلے' وہ ضرور معاشرے کو اس کی باگ پکڑ کر اسے کسی طرف چلائے۔۔۔''

ادیب اور معاشرے کے آپس کے تعلق کے بارے میں شریف کنجاہی صاحب کی یہ رائے بذات خود ان کے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہے جو انسان اور معاشرے کے آزادانہ رویے کے بارے میں وہ رکھتے ہیں۔

دیکھا جائے تو شریف کنجاہی صاحب کی ذات اپنے اندر ایک مکتب فکر کی حیثیت رکھتی ہے اور ایک ایسی ادبی تاریخ کو مرتب کرتی ہے جو ہمارے سماج کا جزو لاینفک ہے۔ اس تاریخ کا ہی حصہ ہیں وہ کچھ خطوط جو ان کے نام آتے رہے ہیں اور ان خطوط کی ادبی اور تاریخی اہمیت اپنی جگہ لیکن ان کو لکھنے والوں کی اہمیت اس سے بڑھ کر ہے کہ ان میں شامل ہیں۔ حفیظ جالندھری' ساحر لدھیانوی' صادقین' میرزا ادیب' علی عباس جلالپوری' احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر جمیل جالبی' حفیظ تائب' اسلم رانا' پروفیسر سمیع اللہ قریشی' مشفق خواجہ' غلام محمد پرویز' ڈاکٹر نظام الدین ایس گورکر' ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش' بیگم منیر احمد شیخ' مظفر علی سید' کشور ناہید' سید انیس شاہ جیلانی' منو بھائی' سجاد حیدر' عبادت بریلوی' مہر کاچیلوی' برجندر سیال' مالک رام' درشن سنگھ آوارہ' دیو پرکاش شرما' چودہدری

فضل حسین، عکسی مفتی، منصور سہیل اور دیگر کتنے ہی لوگ شامل ہیں۔۔۔۔!

نامہ و پیام

ان ناموں کو دیکھا جائے تو کوئی نام بھی ایسا نظر نہیں آتا جو کم اہم ہو۔ اور ظاہر ہے جب یہ شریف کنجاہی صاحب کو لکھیں گے تو ذاتی مسائل و معاملات اور دلچسپیوں پر بھی بات ہو گی لیکن ہر خط میں کوئی نہ کوئی ادبی موضوع زیرِ بحث رہا ہو گا۔ یا پھر ادبی رجحانات پر بھی بات کی گئی ہو گی۔ ان خطوط میں سے بعض منتخب خطوں کے منتخب حصے دیکھتے ہیں۔ سب سے پہلے زیرِ مطالعہ ایک خط جو آتا ہے وہ ہے ساحر لدھیانوی کا، وہ لکھتے ہیں:

برادرم!

سلامِ شوق، میں حالی پبلشنگ ہاؤس کے لیے ''مرگِ انبوہ'' کے فسادات کے متعلق ایک مجموعہ تیار کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کو یہ تکلیف دینا چاہتا ہوں کہ آپ نے ان حالات کے متعلق جو نظمیں کہی ہیں، مجھے ان کی نقل بھیج دیں۔۔۔۔ مجھے مسودہ پندرہ دن کے اندر مکمل کر کے ناشر کو دینا ہے۔ اس لئے اپنی پہلی فرصت میں یہ کام کر دیجئے اور ممکن ہو تو اپنی تصویر بھی بھیج دیں۔

اور کہیے، آج کل کیوں کر گذر رہی ہے؟

آپ کا
ساحر

ظاہر ہے یہ خط تقسیم کے تھوڑا عرصہ بعد ہی لکھا گیا ہو گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت بھی

شریف کنجاہی صاحب اپنے عہد کے اہم لکھنے والوں میں نہ صرف متعارف تھے بلکہ کنجاہی صاحب کا کام بھی ان کے پیش نظر تھا۔ اس کے بعد صادقین کی ایک رباعی ہے، جس پر ۴ جنوری ۱۹۷۵ء کا سن درج ہے اور وہ کچھ یوں ہے:

جناب شریف کنجاہی:

مے نوشی پہ ہے مجھ کو ناز اے ساقی
مغرب نہ عشا سے بے نیاز اے ساقی
لیکن میں حسینوں سے ملاقات کے بعد
شکرانے کی پڑھتا ہوں نماز اے ساقی

ایک اور خط ان کے ''ہیر'' کے حوالے سے کیے گئے کام کی مناسبت سے ہے۔ جو انہیں نامور ادیب میرزا ادیب نے لکھا (مرحوم) کو گلڈ کے عہدیدار ہونے پر شریف کنجاہی صاحب کی طرف سے دی جانے والی مبارکباد کا ذکر بھی ہے:

برادر عزیز، سلام مسنون!

سچی بات پوچھیے تو کہہ دوں گا کہ گلڈ کے عہدیداروں میں میرا شامل ہونا کوئی قابلِ مبارک باد امر نہیں ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں

پھر ذیابیطس! خدا کی پناہ۔

مگر یہ دیکھ کے خوشی ہوئی ہے کہ میرے ساتھیوں نے مجھے اعتبار بخشا ہے، مجھے محبت دی ہے۔ کس زبان سے ان کا شکریہ ادا کروں۔

میں ڈاکٹر اسلم رانا صاحب سے ہیر کی دوسری جلد لے آیا تھا، گھر آیا تو اکیڈمی نے بھی بھیج دی تھی۔

دو جلدیں ہو گئی ہیں، آپ ارشاد فرمائیں تو ڈاکٹر رانا صاحب کو ان کی جلد واپس دے دوں یا آپ فرمائیں تو کسی اور کے حوالے کر دوں۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔

اللہ کرے آپ کی ہمت جواں رہے۔

آپ کا اپنا

میرزا ادیب

اس خط پر ۲۸ جنوری ۱۹۹۴ء کی تاریخ درج ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خط نہ صرف یہ کہ میرزا ادیب کی آخری عمر کے دنوں میں لکھا گیا بلکہ ڈاکٹر اسلم رانا صاحب کے ساتھ بھی موت نے کچھ جلد بازی سے کام لیا تھا۔ خود ڈاکٹر اسلم رانا صاحب کے کنجاہی صاحب کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے بے شمار مضامین ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو شریف کنجاہی صاحب کی ذات سے خصوصی احترام اور عقیدت تھی۔۔۔۔!

ایک اہم اور بھرپور خط علی عباس جلالپوری صاحب کا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ کنجاہی صاحب کے ہم عصر تھے بلکہ انہیں ایک ہی علاقے کے ہونے کی خصوصی قربت بھی حاصل تھی۔ پھر یہ کہ دونوں نے اردو اور پنجابی ادب پر اپنے دیرپا نقوش مرتب کئے۔ اگرچہ یہ خط نجی اور ذاتی نوعیت کا ہے تاہم اس میں بھی دلچسپی کے کئی عناصر شامل ہیں۔ خط پنجابی میں لکھا گیا ہے اس لئے پنجابی ہی میں دیا جارہا ہے تاکہ زبان کا لطف موجود رہے۔ جب یہ خط لکھا گیا تب جلالپوری صاحب کی رہائش نسیم پارک' ساندہ روڈ لاہور پر جبکہ کنجاہی صاحب جلالپور شریف ضلع جہلم یعنی جلالپوری صاحب کے علاقے میں موجود تھے۔ خط پر تاریخ ۱۸ فروری ۸۱ء ہے۔

شریف صاحب' وسدے رہو!

تہاڈا پتر مل گیائے۔ اینہوں پڑھ کے اک زمانہ اکھاں اگے گزر گیا۔ لالہ رخ دے نتیجے بارے اطلاع دین دا دلی شکریہ۔ اوہدا نتیجہ رکنا ہاتے تساں مینوں پتر لکھنا ہا۔ تہانوں ملن دی تانگھ جاگ پئی۔ کدیں گجرات جانا پیا تے تہانوں ضرور ملاں گا۔ تہاڈیاں پیراں نال تے بلی بجھی ہوئی اے۔ کوئی ٹرن پھرن دا سودا سمائے تے ایدھروی چکر مار لینا۔ اج ہے تے بہار دا موسم پر کیہ بہار اے۔

آنے کو تو آتی ہیں جنوں خیز بہاریں
کیا جانئے اب کیوں ہمیں سودا نہیں ہوتا

میں اج کل نرواہاں تسیں جاندے ای او پھکن ہواواں وگن تے

سکیاں بوٹیاں اگن۔

تہاڈا

علی عباس

یوں تو یہ خط آگے بھی چلتا ہے تاہم بعد میں کچھ نجی معاملات ہیں لیکن خطوط کے حوالے سے کوئی نفسیاتی تجزیہ بنتا ہے تو شریف کنجاہی صاحب کے نام لکھے جانے والے خطوط اپنے اندر ایسی کئی حقیقتیں اور ان حقیقتوں کی کئی ایک جہتیں رکھتے ہیں جن کو آگے بڑھا کر اس عہد کی سماجی، سیاسی اور ادبی صورتِ حال کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔

اس کے بعد حفیظ تائب صاحب کا ایک خط ہے جو نہ صرف ان دونوں کے لئے ہی محترم و معتبر شخصیت کے حوالے سے بلکہ پنجابی ادب کا بھی وہ ایک اہم حوالہ ہیں۔ خاص طور پر پنجابی غزل اور پیر فضل گجراتی لازم و ملزوم ٹھہرتے ہیں۔ انہی کے کلام کی تدوین کے سلسلے میں حفیظ تائب صاحب لکھتے ہیں، یہ خط بھی پنجابی میں ہے تاہم اس کے کچھ حصے کا اردو ترجمہ پیش ہے:

''میرے رہبر، محسن اور مہربان شریف صاحب!

نیاز مندی اور سلام!

میرا ارادہ ہے کہ ''پیر فضل گجراتی کا باقی کلام' اسی نام سے چھپوایا جائے۔ میرے پاس چالیس چیزیں ہیں، جن میں سے کچھ قومی نظمیں، کچھ مکمل اور نامکمل غزلیں، کچھ بیت، کچھ کتابوں کی تقریظیں اور کچھ پیر صاحب کے معاصر بزرگوں کی مدح میں کہی گئی نظمیں شامل ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر اس سلسلے میں مشورہ دیں اور کوئی اچھا سا نام سُوجھے تو وہ بھی بتائیں۔ آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ آپ کے پاس پیر صاحب کی اردو غزل بھی محفوظ ہے۔ اگرچہ غزل تلاش کر کے اس کی فوٹو کاپی مجھے بھجوا سکیں تو یہ اور کرم ہو گا۔

جب کبھی لاہور آنا ہو تو مجھے بھی خط کے ذریعے بتا دیا کریں تاکہ آپ کے نیاز حاصل ہو جائیں۔

رب کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا ایک خادم

حفیظ تائب صاحب نے یہ خط انہیں ۷ اپریل ۱۹۹۷ء کو لکھا۔ یہاں پروفیسر سمیع اللہ قریشی کا ۱۹ اگست ۱۹۹۸ء کو لکھے ہوئے ایک خط کا حوالہ اس لئے بھی ضروری لگتا ہے کہ اس میں انہوں نے کنجاہی صاحب کے قرآنِ کریم کے کئے ہوئے ترجمہ کا حوالہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

محترم شریف کنجاہی صاحب' السلام علیکم ورحمتہ!

ترجمے کی پہلی قرأت میں بیچ بیچ میں سے کر رہا ہوں۔ تسلسل سے رب نے چاہا تو زندگی کی شرط ہے' پھر کروں گا۔ ترجمے کا کمال جو آپ کو نصیب ہوا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ پہلے پنجابی میں جو بھی آدھے' پورے ترجمے ہوئے وہ قرآنِ کریم کے لفظوں کا مفہوم تو ادا کرتے۔ لیکن وہ جو قرآنِ حکیم کے اسلوب کا اصل وصف' اس کی عبارت کی نظمیت ہے' وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اس بات کی طرف کسی نے خیال ہی نہیں کیا۔ میرے خیال میں ترجمہ کرتے وقت آپ کے پیشِ نظر بات ہی یہی تھی۔۔۔۔ یہ بات تو کوئی کبھی بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کے ربی (حقیقی) اسلوب تک پہنچ گیا ہوں۔ پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے ترجمے کی عبارت میں قرآنی اسلوب کی نظمیت کا رس اتر آیا ہے۔ سائیں! یہی بڑی بات ہے۔ مبارک باد پیش کرتا ہوں"۔

یہ خط آگے بھی چلتا ہے اور آگے چل کر شریف کنجاہی صاحب کے کئے گئے ترجمے کے حوالے سے اور باتیں بھی کی گئی ہیں۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی پنجابی ادبیات میں قدآور شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا پنجابی ادب پر تنقیدی و تحقیقی کام "لیکھے جوکھے" کے نام سے پنجابی ادبی بورڈ نے چھاپا ہے۔ جس میں ان کی تنقیدی بصیرت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کا کنجاہی صاحب کے تراجم کے حوالے سے اس قدر تعریفی و توصیفی خط شریف کنجاہی صاحب کے فنِ ترجمہ نگاری پر صاد ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی دینِ اسلام سے متعلق وسیع تر معلومات کا آئینہ دار بھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مشفق خواجہ اردو کے اسلوب ساز ادیب اور محقق تھے تو کچھ بے جا نہیں ہوگا۔ ان کا ایک گرامی نامہ ۵ مارچ ۱۹۹۹ء کا شریف کنجاہی کے نام موجود ہے:

محترمی و مکرمی' سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا اس دوران میں نے کتاب کا ایک نسخہ کسی نہ کسی طرح حاصل کرلیا اور اب یہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہ کتاب اس وقت آپ کی خدمت میں کیوں نہ پیش کی جب یہ چھپی تھی۔

ایک اور کتاب بھی آپ کی نذر ہے۔ یہ ادا جعفری کے بارے میں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک مضمون بھی فرمائشی نہیں ہے۔ ورنہ اس قسم کی کتابوں کے لئے مضامین لکھوائے جاتے ہیں۔ ادا جعفری کے بارے میں اب تک جو مضامین رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ یہ ان کا انتخاب ہے۔

امید ہے آپ کو ''قومی زبان'' باقاعدگی سے مل رہا ہوگا۔ اگر کبھی جی چاہے تو اس کی قلمی معاونت فرمائیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ

''قرآنی نظامِ ربوبیت کے پیام بر'' طلوع اسلام کے پرویز کے نام سے کون ہے جو واقف نہیں۔ ان کا شریف کنجاہی صاحب کے نام خط نہ صرف اس احساس کو تقویت دیتا ہے کہ کنجاہی صاحب کا مکالمہ نہ صرف یہ کہ ادبی لوگوں سے رہتا تھا بلکہ علماء اور مذہبی سکالرز کے ساتھ بھی انہوں نے اپنی ذہنی ہم آہنگی پیدا کر رکھی تھی۔ پرویز کا کنجاہی صاحب کے نام خط بہت اہم منطقی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ اُس میں سے کچھ حصے دیکھتے ہیں کہ اس سے ہم شریف کنجاہی صاحب کی فکری اپروچ کا بہتر طور پر اندازہ لگا سکیں گے۔ وہ کنجاہی صاحب کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

محترمی! السلام علیکم!

گرامی نامہ ملا۔ جس شعر کی آپ نے مزید وضاحت چاہی ہے اس کے متعلق عرض ہے کہ اس بند کے سر عنوان یہ لکھا ہے کہ

رند کے اندر جہانِ دل نگر لہٰذا اس کے بعد جو کچھ ہے ان کا تعلق (Mino) کی کیفیات سے متعلق ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اقبال

کے نزدیک دل اور عقل (Intellect) الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ اقبال
کے نزدیک خیالات (Thoughts) کا سرچشمہ دل ہے۔ لیکن وہ زمان
اور مکان کی حدود خصائص اور فروعات سے ماورا ہے۔ جو چیز کسی خالص
مکان (Space) میں ہو اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دائیں
طرف فلاں چیز ہے اور بائیں طرف فلاں چیز۔ لیکن اگر ہمارے دل میں
بیک وقت دو خیال پیدا ہوں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرا فلاں خیال فلاں
خیال کے دائیں یا بائیں طرف ہے۔ اسی طرح خیالات کی نوعیت میں بھی
اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی گردوں کا آشنا ہوتا ہے اور کوئی نارسا۔ اس خیال کو
اقبال نے اپنے خطبات میں، چوتھے خطبہ میں واضح کیا ہے۔۔۔۔۔!

۶ فروری ۱۹۵۷ء کو لکھے ہوئے اپنے اس خط میں آگے چل کر پرویز شریف کنجاہی صاحب کے ''جاوید نامہ'' کے ترجمہ کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ جس مقصد کے لئے حقیقتاً شریف کنجاہی صاحب نے انہیں خط لکھا تھا:

''میں نے آپ کا ترجمہ دیکھا۔ اس سے میرے اس خیال کی تائید ہو گئی کہ پنجابی زبان'' جاوید نامہ'' کے رموز اور حقائق کی متحمل بہ مشکل ہو سکے گی۔ جتنی بڑی ہمت کا کام اس کا پنجابی میں ترجمہ کرنا تھا' اس سے کہیں بڑی جرأت کا کام اس کا شائع کرنا ہوگا۔''

والسلام
پرویز

اس خط میں زیرِ بحث لائے گئے موضوع سے قطع نظر اور اس پر بحث کیے بغیر کہ اپنے عہد کی ایک بڑی شخصیت کس تفصیل سے انہیں جواب مرحمت کر رہی ہے۔ جو بات دیکھنے کی ہے' سوچنے اور احساس کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کنجاہی صاحب اپنے ترجمہ کے سلسلے میں کس قدر سنجیدہ نظر آتے ہیں کہ اگر انہیں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اس کے لئے اہل' قابل اور دانشور لوگوں سے رجوع کرتے ہیں اور جب تک خود اطمینان حاصل نہیں کر لیتے ہیں' اس مسئلے کو اپنا مسئلہ بنائے رکھتے ہیں۔ ایک حقیقی عالم' محقق اور مترجم کی یہی بنیادی خوبیاں اور صفات ہوتی ہیں۔

کنجاہی صاحب جب ''اخبار اردو'' اسلام آباد سے منسلک تھے تو انجمن اسلام اردو ریسرچ

انسٹیٹیوٹ بمبئی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر کا ایک خط ان کے نام ملتا ہے۔

محترم شریف صاحب' سلام شوق!

اخبار اردو (اسلام آباد) باقاعدہ مل رہا ہے۔ بھارت مین اردو میں تحقیق کی صورت حال کے تعلق سے مضمون پڑھا۔ بمبئی کی یونیورسٹی پر تحقیق سے متعلق ایک مضمون آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ امید ہے آپ اخبار اردو میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں گے۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ (بمبئی) کا "نوائے ادب" مل رہا ہو گا۔ قیمتی رائے سے نوازیئے۔ ابھی ابھی مکرمی مشفق خواجہ صاحب انسٹی ٹیوٹ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی پر مسرت کا اظہار کیا ہے اور ہر ممکن تعاون اور مدد کا یقین دلایا ہے۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ دعاؤں میں یاد رکھئے' احباب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

مخلص

نظام الدین ایس گوریکر

بیگم منیر احمد شیخ کا شریف کنجاہی صاحب کے نام خط درحقیقت کنجاہی صاحب کی ذات میں اس اخلاص' ملنساری' محبت اور تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو وہ دیگر لکھنے والوں سے رکھتے تھے۔ یہ خط نامور افسانہ نگار منیر احمد شیخ کی موت کے بعد لکھا گیا۔ ایک طرف جہاں اس خط سے منیر احمد شیخ کی تازہ موت کا صدمہ جھلک رہا ہے' دوسری طرف اس امید افزا ڈھارس کا احساس بھی اجاگر ہوتا ہے جو ایک بہن اپنے بھائی سے توقع رکھتی ہے۔

۱۰ ستمبر ۱۹۹۱ء

محترم بھائی!

السلام علیم! چند دن ہوئے آپ کا خط ملا۔ آپ کا اندازہ درست تھا کہ ہم اس گھر میں منیر کے جانے سے آٹھ ماہ بیشتر رہنے کے لئے آچکے تھے۔ آپ کا پہلا خط اسی لئے مجھ تک نہیں پہنچا۔ میں نے ان دنوں واقعی فرداً فرداً جواب نہ لکھے اور پھر اس سانحے کے چھ سات ماہ بعد جب

قدرے حواس درست ہوئے تو ان دوستوں کی محبت اور خلوص کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے مجھے اس قیامت میں یاد رکھا تھا۔

پچھلے دنوں ''بلھے شاہ'' پڑھتی رہی اور آپ کو بھی یاد کیا۔ آپ کا خط ملا تو حیران رہ گئی کہ آپ کو اس کی خبر کیسے ہو گئی۔ بچے دونوں اگلے برس تعلیم مکمل کر لیں گے۔ بڑا بیٹا بلال منیر ایم بی اے کرنے برسلز (یورپ) گیا ہوا ہے۔ چھوٹا جوہر منیر قائد اعظم یونیورسٹی میں پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کر رہا ہے۔ میں شاید ان کی تعلیمی اور دیگر ذمہ داریوں کے تحت زندہ رہ گئی ہوں۔ ورنہ ایسے پیارے لوگوں کا اٹھ جانے کے بعد زندہ رہنا بے معنی سا ہے۔

آپ جب بھی اسلام آباد آئیں میرے ہاں ضرور تشریف لائیں، مجھے انتظار رہے گا۔ منیر کے دوستوں میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یاد کرنے کا بے حد شکریہ!

خدا حافظ!

آپ کی بہن

نصرت ناہید

سنجیدہ اردو ادب کا کوئی قاری ایسا نہیں ہو گا جو کہ مظفر علی سید کے نام سے واقف نہ ہو گا۔ وہ شاعر بھی تھے، نقاد بھی اور مترجم بھی۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ان کی موت کے بعد ''تنقید کی آزادی'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں شامل مضامین ان کی علمی، ادبی اور فکری بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں جب وہ رسالپور میں تعینات تھے تو انہوں نے مسعود سعد سلمان کی شاعری پر مقالہ لکھنے کی غرض سے انہیں ایک خط لکھا۔ ظاہر ہے ان کے سامنے کنجاہی صاحب کی ایسی شخصیت ہو گی جو اس طرح کے علمی اور تحقیقی کام پر اتھارٹی کی حیثیت کی حامل ہو گی۔ تبھی تو انہوں نے لکھا:

۲۲ دسمبر ۷۹ء

۸۷۔ فلیگ روڈ، رسالپور

حضور انور کو شاید معلوم ہو چکا ہے کہ میں ۲۱ دسمبر کی صبح کو حاضرِ خدمت

ہوا تھا جبکہ آپ کہیں ٹیلیفون کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ ان دنوں مسعود سعد سلمان کی فارسی شاعری پر ایک مقالہ تیار ہو رہا ہے۔ یاد آیا کہ آپ نے کبھی ذکر کیا تھا اس کے ''دیوان ہندوی'' کے پیدا ہونے کا۔ جو کسی وودوان سردار جی کو پوربی پنجاب میں مل چکا ہے۔ اس کی تفصیل اور بعد میں کچھ مزید خبر مل سکتی ہو تو وہ بھی درکار ہوگی۔ چنانچہ زحمت قبول فرمائیے۔

دوسری بات یہ کہ سعد سعود سلمان کے علاوہ یہ بھی ارادہ ہے کہ آپ کی نظم و نثر اردو پنجابی سب کو سامنے رکھ کر کچھ لکھا جائے۔ میرے پاس تو صرف آپ کی بخشی ہوئی ''جھاتیاں'' ہی نکلیں تو نکلیں' اگرچہ وہ بھی اس وقت دسترس میں نہیں۔ مجموعہ کلام فارسی رسم الخط میں چھپا ہوا کبھی نظر پڑا تھا مگر خرید بھی لیتا تو اس وقت جب کہ خانہ بدوشی کو کئی سال ہو چکے ہیں' خدا جانے کہاں ہوتا۔

میری آسانی کی خاطر آپ کی مطبوعہ تحریروں کی ایک چیک لسٹ تیار ہو جائے تو پھر ایک ایک کر کے ان کی تحصیل کی طرف توجہ دی جائے۔ (اوران میں سے جو چیز آپ کی طرف عاریتاً مل جائے' اس وعدے کے ساتھ کہ استعمال کے بعد لوٹا دی جائے گی۔ اس میں ادبی اور دوسری درسی کتابیں' ترجمے' مضامین' متفرقات' اس کے علاوہ ایک سوانحی خاکہ جس میں خاندانی پس منظر اور مشاغل وغیرہ کی تفصیل بھی ہو سب کی تفصیل سال بہ سال مرتب ہو تو بہت اچھا ہو۔ آپ کے بارے میں جو کچھ اب تک لکھا گیا' فارسی یا گورمکھی رسم الخط میں اور آپ کو یاد ہو تو اس کی نشان دہی بھی فرمائیے۔ اس سلسلے میں منو بھائی' شفقت' قلعہ داری صاحب اور دوسرے اصحاب کو زحمت دی جائے گی۔ اردو کی حد تک تو میری نظر میں میرا جی اور عسکری کے انتخاب کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ پنجابی میں کیا لکھا گیا ہے اس سے میں واقف نہیں۔۔۔۔!

تنقیدی مقالے کی ضرورت ہے جس کا بیڑا اٹھانا آسان ہو تو بھی اس

کی تکمیل میں بہت سی مشکلات کم سے کم میرے لئے ضرور حائل ہیں۔ ان میں سے کچھ آپ کی مدد سے رفع ہو سکیں تو بہت عنایت ہو گی۔

منیر شیخ صاحب کا دہلی سے خط آیا ہے وہاں سے کچھ مطلوب ہو تو وہ وہاں سے پیدا کر لے گا۔

آپ کی توجہ کا انتظار رہے گا۔

باقی باقی

آپ کا نیاز مند

مظفر علی سیّد

انسانی رشتوں اور تعلقات کے ضمن میں جو مثال بیگم منیر احمد شیخ (نصرت منیر) کے خط کے حوالے سے دی گئی تھی' اس کا دوسرا رخ کشور ناہید کا شریف کنجاہی صاحب کے نام خط ہے جو انہوں نے تعزیت کے لئے لکھا تھا۔

شریف بھائی!

تعزیت کرنا مجھے اپنوں سے نہیں آتا۔

آپا کا اٹھ جانا آپ کے لئے ہی نہیں' ہم سب کے لئے غم کا پہاڑ ہے کہ زندگی میں ان عذابوں میں دعا کے لئے اٹھنے والے ہاتھ نہ رہیں تو سر پر سے سائباں کے غائب ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ خدا آپ کو صبر کرنے کی توفیق دے۔ میں یہ بھی تو نہیں کہہ سکتی کہ یہ رشتہ تو عمر کی گرہیں جتنی ڈھیلی پڑیں' اتنا ہی مضبوط ہو جاتا ہے۔

یوسف علاج کے لئے لندن گئے ہوئے ہیں۔ تنہا گھر کا فرض اٹھایا ہوا ہے۔ دعا کریں کہ خدا بہتر کرے۔ وہ ہوتے تو میں گجرات کا چکر ضرور لگاتی۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

آپ کی

کشور ناہید

یہ تو تھے پاکستان میں موجود ان کے احباب' نامور ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط۔ جو نہ صرف یہ کہ شریف کنجاہی صاحب کی شخصیت' ان کے فن' فکر اور نظریئے کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت

ہوتے ہیں بلکہ ان کے ادب کے ساتھ کومٹمنٹ اور ہم عصر ادیبوں کے ساتھ اہم فکری و تہذیبی معاملات پر مکالمہ جاری رکھنے اور کوئی نہ کوئی فکری مغالطہ دُور کرنے اور فلسفیانہ نقطہ سمجھنے کے ان کے رویے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اب آخر میں تین ایسے اشخاص کے خطوط کے اقتباسات دیکھتے ہیں جو پڑوسی ملک میں پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے ان سے رابطہ رکھے ہوئے ہیں یا پھر تقسیم سے پہلے کی یادیں سانجھی کر رہے ہیں۔ ان میں محض تین خطوط کے اقتباسات بطور نمونہ دیئے جا رہے ہیں ورنہ ان کے پاس ایسے کئی خطوط موجود ہیں۔ ان میں پہلا خط ''آگرہ'' سے برجندر سیال کا ہے۔ دوسرا ''دلی'' سے مالک رام کا اور تیسرا ''پٹیالہ'' سے درشن سنگھ آوارہ کا۔ برجندر سیال کے خط پر ۲۶۔۷۔۰۹۔۱۴ کی تاریخ درج ہے۔ لکھتے ہیں:

شریف جی!

خوش رہیئے! بہت دن ہو گئے آپ کو ایک نامہ شاہ دولہ محلّہ کے پتہ پر ارسال کیا تھا۔ نجانے آپ تک پہنچا کہ نامہ بر مارا گیا۔ ہائے۔

(گجرات) کا جو ذکر کیا تم نے ہم نشیں

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

آپ وہاں جایئے تو میری آتما کو بھی ساتھ لے کر گلیوں اور سڑکوں کی راہ نوردی کیجئے کہ میں:

جان دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

لال منڈو کے سامنے سرکلر روڈ پر بڑے دروازے والا ایک مکان اور اس کے گردونواح ۔۔۔ محلہ کھوجیاں والا ۔۔۔۔ مشن سکول سے لے کر گورنمنٹ کالج کی دُوری ۔۔۔۔ کابلی دروازہ ۔۔۔۔ شیشیانوالہ گیٹ ۔۔۔۔ مرتضیٰ، ستار، شفیع خالد اور منظور کے مکان بھی مجھے خوب یاد ہیں۔ گجرات سے کنجاہ تک تانگے کا راستہ بھی کئی بار طے کیا ہے اور نسیم صاحب کھوجیاں والی ۔۔۔۔ کی دعوتِ شیراز بھی نہیں بھولا۔ نسیم اکثر یاد آتا ہے۔ دکھ یہ ہے کہ وہ یہیں تھا لیکن میں اس کی موت سے کچھ دن پہلے ہی مل پایا۔ آپ سے اس نے والہانہ عشق کیا تھا اور بے پناہ قائل تھا آپ کی صلاحیتوں کا۔ ہائے کیا دوست دار تھا، کیا آدمی تھا، لکھنو میں خاص

دھاک جما رکھی تھی اس نے۔ خیر دنیا چلتا پھرتا تماشا ہے' دلوں کے بیوپار کا' احساسات کا' دکھ سکھ کا' کون کس سے کہاں ملتا ہے' بچھڑ جاتا ہے' کون جانے۔۔۔۔۔۔؟

کل آپ کی کئی بار پڑھی ''جھاتیاں'' پڑھتا رہا۔ آپ کا من بھی بہت سندر ہے شریف جی۔ اور زبان جادوگری ہے۔۔۔۔ اس چاہ میں کہ شاید وہ نزاکت آواز سننے کو مل جائے' اکثر ریڈیو کی سوئی لاہور کو گھما لیتا ہوں اور اپنی گیارہ سالہ بچی رچی سے کہتا ہوں' یہاں سے ہوسکتا ہے تمہارے ایک ان دیکھے انکل کی آواز گونجے۔۔۔۔ اب آپ کا پروگرام ہو تو پیشتر خبر دیجئے۔۔۔۔۔! یہ خط ابھی اور زیادہ طویل ہے۔ جس میں ماضی کی ماقبل تقسیم کی یادوں کو دہرایا گیا ہے اور ساتھ ساتھ کنجاہی صاحب کی فنی عظمت کو بھی سراہا گیا ہے۔ اور آخری جملہ ہے۔۔ پیار بھری نیک خواہشات کے ساتھ۔۔۔۔۔ برجندر

اس سے اگلے دو خطوط بھی تقریباً اسی نوعیت کے ہیں لیکن چونکہ دونوں لکھنے والے مانے ہوئے ادیب ہیں مالک رام اور درشن سنگھ آوارہ۔ درشن سنگھ آوارہ نے تو تقریباً برجندر ہی کی طرح سے ماضی میں آباد شہر اور اس شہر سے جڑی یادوں کو دہرایا ہے لیکن ساتھ ساتھ اردو اور پنجابی شاعروں' ادیبوں سے اپنے تعلقات اور ان کے بچھڑ جانے کے حوالے سے بھی لکھا ہے۔ جس طرح کہ کہا جاتا ہے کہ ''خط آدھی ملاقات ہوتا ہے'' اگر وہ ادبی تناظر میں لکھا گیا ہو تو اگر پورا نہیں تو ''آدھا ادب'' ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ان دو خطوں میں تو پورا پورا ادبی ذائقہ موجود ہے۔ مالک رام ۳ مئی ۱۹۸۸ء کو نیو دہلی سے لکھتے ہیں:۔

محب مکرم! بہت دن کے بعد آپ کے سواد خط سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ شکریہ قبول فرمائیے!

حضرت امیر خسرو کا عرس تو چند دن میں آ رہا ہے' کیا آپ اس موقع پر تشریف لانے والے ہیں ''چشم ماروشن دل ماشاد'' ''تلک'' کی کتاب اب کہاں ملے گی۔ ۶۰-۷۰ برس کی چھپی ہوئی کتاب کہاں رکھی ہوگی۔ کہیں سے چھپی بھی نہیں۔ کبھی کبھی یاد فرماتے رہئے گا۔ اب کیا کرنے کا ارادہ ہے' بیکار تو آپ بیٹھ نہیں سکتے۔

والسلام

خاکسار

مالک رام

اس کے مقابلے میں ۴ ے۔۱۲۔۴ کو پٹیالہ سے لکھا ہوا درشن سنگھ آوارہ کا خط زیادہ جذباتی بھی ہے اور تفصیلی بھی۔ اس کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے۔

پھل ایسے ڈالیوں جھڑ گئے نے گلزار دی اکھ وچ اتھرو نیں

کلیاں تاں چھج چھج رونا سی' ہر خار دی اکھ وچ اتھرو نیں

ویر شریف' خیراں! چوکھیاں خیراں دی اڈیک مگروں ورہیاں دی بند کیتی ہوئی باری کسے نہ کسے طرح کھلی ہے۔ تے اوس وچوں میل دیاں خوشیاں دے چھنکدے ماہیے دی آواز آن دی تھاں وچھڑ گئے یاراں پیارے بجناں تے متراں دے وچھوڑے دے اداس اداس ہو کے ای ملے نیں۔ آہ! ایہناں بند دروازیاں دیاں جھیتاں وچ تکدیاں تکدیاں تے جھاکدیاں کتنیاں ای روحاں ڈوراڈاری لاگئیاں تے کلیجے وچ سدا وسدے رہن والے پھٹ لاگئیاں نے۔ ایس ظالم وچھوڑے نے میرے پیر فضل حسین' ویر غلام یعقوب انور' ویر ممتاز حسین' ڈاکٹر فقیر صاحب تے ہور کئی متراں نوں میتھوں کھوہ لیا ہے۔ تے ہن زندگی بھر اوہناں دیاں پیاریاں صورتاں نوں اکھیاں ترسدیاں ترسدیاں ای اک دن بند ہو جاون گئیاں۔۔۔۔

ویر ممتاز ہوراں دی اک چٹھی مینوں سویٹزرلینڈ توں ساڈی یونیورسٹی دے اک ممتاز پروفیسر دے ہتھ ملی سی۔ جس دا میں جواب اجے دینا سی کہ اوہاں دے عزیز دی چٹھی نے میرے دل تے کاری سٹ ماری۔ میں تاں ویر ممتاز ہوراں پاس کراچی جا کے مہمان ہون دیاں تیاریاں کر رہیا ساں کہ اوہ کراچی نوں تاں کیہ ایس سنسار نوں ای چھڈ کے چلے گئے ہن۔ پھیر ویر غلام یعقوب انور دا بھلا کوئی فوت ہو جان دا ویلا سی۔۔۔۔

۔۔۔ پیر فضل ہوراں نوں تاں چاہیدا سی کہ اوہ ذرا میری اڈیک کر

لیندے۔ میرا اوہناں دا فاصلہ کوئی بہتا نہیں سی۔ پر مرضیاں دے مالک نیں۔۔۔۔۔اوہناں نوں کوئی کیہ آکھے۔

میں تہاڈی چٹھی دی بے صبری نال اڈیک کراں گا۔ سبھے ای بھراواں نوں پیار بھری یاد تے سلام عرض کرنا تے جواب دین دی کاہلی کرنا۔ باقی گلاں تہاڈی چٹھی دے جواب وچ لکھاں گا۔

پیار نال

آوارہ

شریف کنجاہی صاحب کی ذات' ان کی شخصیت' فن' فکر اور نظریئے کے حوالے سے لکھتے ہوئے بظاہر ان خطوط کی کوئی جسٹی فکیشن نہیں بنتی۔ لیکن اس وقت کہ جب دنیا بھر میں تمام علوم و فنون میں سپیشلائزیشن کا عہد ہے اور کنجاہی صاحب بذات خود اس امر پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ کوئی بھی کام کرتے ہوئے محنت' دیانتداری اور سچائی کو پیش نظر رکھنا ہی آج کے عہد کے لکھنے والے کی بنیادی خوبی اور خوبصورتی ٹھہرتی ہے۔ کسی بھی واقعے' مسئلے' تجربے' تجزیئے اور مشاہدے کو کسی بھی صنف میں اظہار بنانے کے لئے اس کے بارے میں مکمل جانکاری کرنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ انہوں نے صرف اس بارے میں کہا ہی نہیں' اس کا عملی ثبوت بھی مہیا کیا ہے اپنی تخلیقات میں۔ تو جب شریف کنجاہی صاحب تکمیلیت پسندی پر یقین رکھتے ہیں اور ہم یہ مانتے ہیں کہ موجودہ عہد سپیشلائزیشن کا ہے۔ تو پھر ہمیں ان کی فکر اور فن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ان کی ذات کے خفیہ اور کھلے' داخلی اور خارجی ہر دو پہلوؤں پر بات کرنا ہوگی اور پھر خطوط اور وہ بھی کسی عہد کے نامور ادیب کے نام' اس عہد کے نامور ادیبوں/ شاعروں اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والوں نے لکھے ہوں تو ان کی اور زیادہ اہمیت بن جاتی ہے۔ خاص طور پر ہمارے سامنے غالب اور اقبال جیسی ہستیوں کے خطوط بطور مثال موجود ہیں اور جنہیں ادب' زبان' گرامر اور اسلوب کو جاننے کے لئے پڑھنا لازمی سمجھا جاتا ہو۔۔۔۔

ان تمام مثالوں سے بڑھ کر اس عہد میں کہ جب نفسیات اور نفسیات دانوں کے نزدیک کسی بھی شخصیت کا مطالعہ کرنے کے لئے اس کے اور اس کے نام آنے والے خطوط کا مطالعہ ناگزیر قرار دیا گیا ہو تو پھر اس پہلو سے مطالعہ اور زیادہ اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ جس طرح کہ ہم نے شریف کنجاہی صاحب کے نام آنے والے خطوط دیکھے ہیں۔ (ظاہر ہے کہ بہت سے خطوط کا مطالعہ تنگیٔ

وقت اور تنگ دامنیٔ صفحات کے خوف سے چھوڑ دیا گیا ہے) ان سے نہ صرف کنجاہی صاحب کی ادبی شخصیت اجاگر ہوتی ہے بلکہ ان حالات وواقعات سے بھی ہم آشنائی کا موقع ملتا ہے۔ جواب ہمارے نزدیک ماضی کا حصہ ہیں لیکن شریف کنجاہی صاحب اور ان کے دوست احباب کے لئے انہی حالات اور ان حالات کی یادوں میں لکھنے کے لئے بہت سا خزانہ موجود ہے۔۔۔۔۔!

جیسے کہ پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ کنجاہی صاحب نے شاعری' تنقید' ترجمہ نگاری اور تحقیق کو بطور خاص اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اب ہم ان کی کتب کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ زمانے کے ترتیبی لحاظ سے انہوں نے کیا کچھ کیا۔

تخلیقی سفر کا رنگ

جیسا کہ آگے چل کر ہم تفصیلی مطالعہ کریں گے اور بہت سے لکھنے والوں کی طرح شریف کنجاہی صاحب کی پہلی محبت بھی شاعری ہی نظر آتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ ان کی باضابطہ طور پر چھپنے والی شعری مجموعہ نہ تھی۔ بلکہ ایک نثری ترجمہ تھی اور وہ بھی رسل جیسے مشکل فلاسفر کی یوں باقاعدہ تخلیقی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۳۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب ''پریت لڑی'' (گورمکھی) میں ان کی نظم ''ون وابوٹا'' شائع ہوئی۔ باقی تفصیل تاریخی اعتبار سے کچھ یوں ہے:۔

۱۹۳۹ء آزادی کی راہیں (ترجمہ) برٹرینڈ رسل

۱۹۴۱ء آزاد سماج' (کروپاٹکن کی کتاب Conquest of Bread کے چند ابواب کا ہندی سے اردو ترجمہ۔

۱۹۵۳ء ہمارا جسم

۱۹۵۸ء جگراتے (جگتار سنگھ) نے گورمکھی زبان میں انڈیا سے چھپوائی۔

۱۹۶۰ء جھاتیاں

۱۹۶۵ء جگراتے (اردو رسم الخط)

۱۹۷۷ء جاوید نامہ (منظوم پنجابی ترجمہ)

۱۹۷۷ء علم الاقتصاد (پنجابی ترجمہ)

۱۹۷۸ء کہے فرید (بابا فرید گنج شکرؒ کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ)

۱۹۸۰ء پنج سورہ (منظوم پنجابی ترجمہ)

۱۹۸۰ء پنجابی شاعری کا انتخاب (منظوم اردو ترجمہ)

۱۹۸۱ء مختصر پنجابی ڈکشنری

۱۹۸۳ء پنجابی شاعری کا انتخاب (اردو ترجمہ)

۱۹۸۴ء شاہ دولہ دریائی۔ حیات و تعلیمات

۱۹۸۶ء جگراتے (اشاعت مکرر)

۱۹۸۶ء جھاتیاں (اشاعت مکرر)

۱۹۸۸ء نبی پاک کے خطبے (ترجمہ پنجابی)

۱۹۹۱ء اسکینڈے نیویا کے لسانی رابطے

۱۹۹۲ء ستارۂ سحری

۱۹۹۳ء ہیر وارث شاہ (اردو ترجمہ)

۱۹۹۳ء خطباتِ اقبال (ترجمہ اردو)

۱۹۹۴ء سورج، سوچ اور سائے (اردو مجموعہ کلام)

۱۹۹۵ء لمحوں کا صحرا (مجموعہ کلام اردو)

۱۹۹۵ء اوڑک ہوندی لو (مجموعہ کلام پنجابی)

۱۹۹۶ء ترجمہ گلشن راز جدید از محمود شبستری

۱۹۹۷ء دو دِل (فارسی کلام)

۱۹۹۹ء پاکستانی پنجابی شاعری (انتخاب)

۲۰۰۰ء تاریخِ گجرات، لفظوں کی عینک (تحقیق)

۲۰۰۴ء رگ وید اک جھات (تحقیقی)

۲۰۰۵ قرآن حکیم کا پنجابی ترجمہ (دو جلدیں)

۲۰۰۵ جپ جی اک جھات (ترجمہ و تحقیق)

ساہواں دا ویزا (آپ بیتی)

ابھی وہ کام کر رہے ہیں اور بعض نہایت عمدہ اور اہم کلام ان کے زیر مطالعہ ہے۔ جس پر وہ لکھنے کا رادہ بھی رکھتے ہیں۔ ان پر اردو اور پنجابی میں ''پنجاب یونیورسٹی'' لاہور میں تحقیقی کام ہو چکا

ہے۔ علاوہ ازیں ''ویرتوں کنجاہ دا ایں'' شریف کنجاہی انکار سے اقرار تک'' ان کے تفصیلی انٹرویوز' شریف کنجاہی کی پرورش لوح وقلم ۔ ان کا عمومی وتاثراتی مطالعہ ہے جب کہ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے (اردو) جو شازیہ خورشید نے رقم کیا ہے۔ اس کا موضوع ہے شریف کنجاہی کی ادبی خدمات۔ غزالہ رفیق کے تحقیقی مقالہ کا جو پنجابی میں ہے موضوع ''جھاتیاں دا تنقیدی تے تحقیقی جائزہ'' ہے۔ بے شمار رسائل و جرائد میں ان پر مضامین اور ان کے انٹرویوز کے علاوہ دسمبر ۱۹۴۴ء کے ''لہراں'' لاہور کا ایک ضخیم ''شریف کنجاہی نمبر'' جبکہ ماہنامہ ''غنیمت'' لاہور کا ایک مختصر نمبر بھی شائع ہو چکا ہے۔

ان کی تصنیفات کا جائزہ لینے کے بعد بجا طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نہ صرف معاصر اردو/ پنجابی ادب میں شریف کنجاہی صاحب ایک کلاسیک کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ شریف کنجاہی صاحب حوالہ ہیں ایک روشن تاریخ کا' ایک کامیاب تحریک کا۔ وہ ادب میں متانت' شرافت اور نجابت ہی کا حوالہ نہیں ہیں بلکہ وہ محبت کے وہ سفیر بھی ہیں جو اپنی سفارت کا کام لفظوں سے' مصرعوں سے اور سطروں سے لیتے ہیں۔

جو کچھ کہ انہوں نے لکھا پڑھنے والوں نے' اس کے چاہنے والوں نے اور حکومت پاکستان نے انہیں پنجابی ادب کی خدمات کے عوض ''تمغۂ امتیاز (۱۹۸۳ء) جب ۲۰۰۰ء پرائڈ آف پرفارمنس سے بھی نوازا۔ اس کے علاوہ انہیں اہلِ شہر (گجرات) نے ۱۹۸۰ء میں ''نشانِ گجرات'' (ادبی ایوارڈز کونسل' گجرات) اور ۲۰۰۴ء میں بزمِ غنیمت کنجاہی' نے ان کی رسمِ تاجپوشی بھی کر رکھی ہے۔

وہ پنجاب یونیورسٹی' لاہور' اکادمی ادبیاتِ پاکستان' اسلام آباد اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ' لاہور کے علاوہ کئی ایک تعلیمی اور ادبی اداروں کے اعزازی ممبر بھی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ شریف کنجاہی صاحب کی ادبی خدمات کو نہ صرف یہ کہ جانا گیا ہے بلکہ ان کا اعتراف کیا گیا ہے اور انہیں ان کی ذات کے شایانِ شان محبتوں سے نوازا گیا ہے۔

۱۹۸۰ء میں ''لندن'' میں پنجابی زبان وادب کے حوالے سے منعقدہ کانفرنس میں شرکت کے ساتھ ساتھ اسی سال حج مبارک کے فریضہ سے بھی سبکدوش ہوئے جبکہ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۷ء میں ناروے کا مطالعاتی دورہ بھی کر چکے ہیں۔

یوں زندگی کی یہی رنگارنگی' تجربات ومشاہدات' دنیا' اہلِ دنیا' کائنات اور کائنات کی بوالعجبیوں پر گہرا غور وفکر اور سوچ بچار ہی ہے جو ان کی تخلیقات میں لفظ بن کر لو دیتا ہے اور رہروانِ عشق کے

لئے رہبر و رہنما کا کام دیتا ہے۔

''جگراتے'' کا فیض' یہ ستارہ سحری

شریف کنجاہی کی مشہور نظموں میں سے ایک نظم ہے ''ون دا بوٹا'' جس کے کچھ مصرعے ہیں:۔

میں ون دا سنگھنا بوٹا
ٹھنڈیاں میریاں چھاواں
مٹھیاں میریاں پیلوں
وے توں راہیا جاندیا
بھکھن بھانیا' ماندیا
آ جا' جھٹ گھسالے
میریاں پیلوں کھالے
میری چھاویں بہہ لے

ان کی اپنی ذات انسانیت کے لئے اور ان کا فن' ان کی فکر پنجابی زبان و ادب کے لئے ون کے اس گھنے شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی ہے اور جس طرح یہ درخت اس زمین سے اپنی جڑیں سکیڑتا' سمیٹتا جا رہا ہے۔ شریف کنجاہی جیسے عظیم اخلاقیات کے حامل افراد بھی پرانی داستانوں' قدیم قصہ کہانیوں میں سانس لیتے کرداروں کی مانند لگتے ہیں۔ وہ پنجابی ادب میں' اس کے فروغ' اس کے ارتقاء میں روشن استعارہ کی مثال ہیں۔ شاعری' تنقید' تحقیق' لسانیات' ترجمہ نگاری میں جس نوعیت کا کام انہوں نے کیا ہے وہ ایک انسان کا نہیں' اداروں کا کام تھا۔ اور وہ اس وقت پنجابی ادب کی

طرف آئے جب ابھی فارسی میں لکھنے کا رجحان تھا اور جب اردو میں ہر حوالے سے کام کیا جا رہا تھا۔ ادب میں بڑے بڑے نام اور بہت اہم تحریکیں فروغ پا رہی تھیں۔ شریف کنجاہی صاحب نے بھی اپنا سفر اردو ادیب' اردو شاعر کے طور پر آغاز کیا تھا اور اس وقت کہ جب جدید پنجابی اپنے نقوش ترتیب دے رہی تھی۔ انہوں نے اردو شاعری میں ایک نام ایک مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس کی ایک بہترین مثال "حلقۂ ارباب ذوق" کی جانب سے چھپنے والے انتخاب میں شامل ہونے والی ان کی نظم "پسپائی" تھی۔ جسے اردو نظم کے بنیادی شاعروں میں سے میرا جی نے ترتیب دیا اور یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ بعد میں انہوں نے اپنی اس نظم کو "سرنڈر" کے نام سے "ستارۂ سحری" میں شامل کیا۔

اس وقت کہ جب نئے رجحانات' نئے رویے' نئے فلسفے' نئے افکار اور نئے تجربات کی دنیا کے در اردو زبان میں لکھنے والوں پر کھل رہے تھے' شریف کنجاہی نے اپنے آپ کو ان افکار و تجربات کا حصہ بناتے ہوئے پنجابی زبان و ادب کی طرف رجوع کیا۔ اور احمد راہی اور باقی صدیقی کی طرح دونوں زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنایا تاہم احمد راہی اور باقی صدیقی کی نسبت ان کی جو تخصیص بنتی تھی وہ تھی نظم کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف ادب میں اظہار کی نئی نئی راہیں دریافت کرنا اور ان نئے فلسفوں اور نئے فلسفوں سے تشکیل پانے والی تحریکوں کے نقطہ ہائے نظر کو دیگر اصناف میں بیان کرنا۔ یوں ایک طرف تو ان کے سامنے پنجابی زبان و ادب کی صدیوں پر مشتمل وہ لوک روایات اور فوک وزڈم تھی اور دوسری طرف اردو' فارسی اور انگریزی کے ذریعے عالمگیر انسانی فلسفے کی روایت۔ یہ سب کچھ شریف کنجاہی صاحب کے یہاں آ کر اعلیٰ آدرشوں کے حامل ادب کا اعلیٰ نمونہ بن گیا۔ اور جہاں تک ان کا پنجابی زبان کی جانب مراجعت کا معاملہ ہے اس کا ایک اشارہ تو ہمیں اس انٹرویو میں بھی ملتا ہے جو روزنامہ "مشرق" کے لئے انہوں نے انتظار حسین کو دیا۔ جب انہوں نے ان سے پوچھا کہ "اردو شاعری کرتے کرتے اچانک انہوں نے پنجابی شاعری کس لئے شروع کر دی" تو اس کا مدلل اور مربوط جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا' کہ:-

"اردو شاعری کرتے ہوئے میں محسوس کرتا تھا کہ میں اپنی شاعری میں پنجاب کی مٹی کی مہک نہیں رچا بسا سکتا۔ جب کہ پنجابی شاعری میں یہ مہک اپنے آپ ان رچتی ہے اور دھرتی میں سے پھوٹ کر پوری فضا کو مہکاتے ہوئے اسے پھولوں جیسا بنا دیتی ہے۔"

یہ بات وہ شاعر کہہ رہا تھا کہ جس کی اولین نظموں میں سے ایک نظم کو میرا جی حلقہ ارباب ذوق کے سالانہ انتخاب میں شامل کر رہے تھے۔ تو دوسری طرف اسے فراق گورکھپوری نے جدید نظموں کے انتخاب میں بھی شامل کیا۔

یہ وہ شاعر تھے جو اپندر ناتھ اشک کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی جریدہ ''پریت لڑی'' سے اپنے سفر کا آغاز کر رہے تھے۔ جب انہوں نے پنجابی میں لکھنے کا ارادہ کیا تو موہن سنگھ کی ''ساوے پتر'' امرتا پریتم کی ''نویں رت'' احمد راہی کی ''ترنجن'' کے ساتھ جدید پنجابی کا نظم کا جو نقشِ اولیں قرار پائی وہ اسی شاعر شریف کنجاہی کی ''جگراتے'' تھی۔ جس میں ایسی ایسی شاہکار نظمیں شامل ہیں جو انسانی وجود کا مجسم اظہار کہی جا سکتی ہیں۔ جو انسان کے لئے ایک روشن صبح کا پیغام بن کر آتی ہے جو انسانیت کے لئے اس جنتِ ارضی کے خواب کو تعبیر عطا کرتی ہے۔ جو چشم آدم میں روشن ہوا اور جو آج بھی روشن ہے۔ وہ عالمگیر انسانی مساوات اور برابری کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

''جے میں آکھاں اسیں تسیں ہاں اک آدم دے جائے
کیوں مڑ اک وگاراں کٹے تے اک ویہلیاں کھائے
جے میں آکھاں دنیا اتے بے گھر کوئی نہ ہووے
جے میں آکھاں بڈھے ویلے ٹوکری کوئی نہ ڈھوئے
جے میں آکھاں مِسا لُونا سارے رل کے کھائیے
اک دوجے دیاں باہواں بنیے نالے بھار ونڈائیے

یہ اس عظیم انسانی فلسفے اور ترقی پسندانہ خیالات کی غماز نظم ہے۔ جو لکھنے کے آغاز سے آج تک شریف کنجاہی کی سوچ' ان کی فکر' فلسفے اور تجربے کی بنیادی خاصیت رہی ہے۔ اور شاید ''جگراتے'' اس لئے بھی آج تک جدید پنجابی نظم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ آج نصف صدی کے بعد وہی افکار انسانی آواز کا روپ دھار رہے ہیں جن کو شریف کنجاہی صاحب نے اپنی بامقصد شاعری کا حصہ بنایا تھا اور عالمگیریت کے فلسفے کو تقویت پہنچانے کے لئے کہا تھا:۔

'' اجے اساں امن لئی بڑا کجھ کرنا ایں
جنگ دے ڈھولیاں توں سوڑیاں نہ پیا جے
بمب دے گولیاں توں سوڑیاں نہ پیا جے

کھنڈراں تے کھولیاں توں سوڑیاں نہ پیا جے
امن دیاں بیڑیاں نیں ڈب کے ای ترنا ایں
اجے اساں امن لئی بڑا کجھ کرنا ایں

عالمگیر امن کے خواب دیکھنے والے اس شاعر کی تربیت جس ماحول میں ہوئی' تربیت کا وہ ماحول ان سے یہ تقاضا کرتا تھا کہ وہ اپنے شعروں اپنی فکر اور اپنے فلسفے میں خیر' حسن اور محبت کے پھولوں کو مہکائیں۔ خود شریف کنجاہی صاحب کے اپنے لفظوں میں ان کے والد غلام محی الدین اور دادا محمد امین اپنے وقت کے اچھے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں ایک مولوی صالح بھی تھے اور فقیر تخلص کرتے تھے' وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے ہم عصر اور ہم نشیں تھے۔

ڈاکٹر غلام حسین اظہر رقم طراز ہیں کہ شریف کنجاہی صاحب نے اپنی شعر گوئی کے بارے میں ان سے بات کرتے ہوئے کہا:۔

''کالج کے زمانے سے ہی میری شعر گوئی کا آغاز ہوا لیکن علی عباس جلالپوری صاحب کے علاوہ جو میرے کلاس فیلوز تھے وہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ میں شاعر ہوں۔ میں نے اب تک اپنا کلام دوستوں کو شاذ ہی سنایا تھا۔ بے تابیٔ اظہار مجھ میں کسی دور میں بھی نہیں رہی۔ بعد میں جب بحیثیت شاعر متعارف ہوا تو میرے کئی دوستوں کو حیرت بھی ہوئی''

بات یہیں تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے ماضی میں موجود ان رویوں' ان جذبات واحساسات کو بھی عمل دخل رہا ہے جو ان کے خمیر سے ان کے خون میں شامل ہو گئے تھے۔ اساتذہ میں سے والد صاحب نے میرے ذوق کو پروان چڑھایا۔ وہ خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے' میرے دادا جی بھی شعر کہتے تھے' صرف پنجابی زبان میں۔ گھریلو ماحول کے علاوہ میری اردو شاعری کو پروان چڑھانے میں حفیظ جالندھری صاحب کا بھی بہت حصہ ہے۔''

وہ مزید کہتے ہیں:۔

''میری والدہ نے بھی فارسی نظم ونثر کی مشہور کتابیں گلستان و بوستان دادا

جان سے پڑھیں۔ فارسی شعراء خصوصاً سعدیؔ، حافظؔ اور جامیؔ کے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے۔ اردو کا رواج عام نہیں تھا، پنجابی کی چند ایک نظمیں کہی تھیں، خاندانی حالات واقعات سے متاثر ہو کر، اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ شعری ذوق مجھے ورثہ میں ملا تھا۔''

اور انہوں نے اس وراثت کو اپنی ہفت پہلو ذات کی رنگارنگی سے یوں ہم آہنگ اور بھرپور کیا کہ آج شریف کنجاہی صاحب ایک ذات سے بڑھ کر ایک انجمن، ایک ادارے کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ پنجابی زبان و ادب میں ایک لیجنڈ کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں اور اگر معاصر ادب میں کسی ادیب کو کلاسک قرار دیا جا سکتا ہے تو اس ادیب کا نام ہے شریف کنجاہی۔

اس بات سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ ادبیاتِ عالم کے فنی سانچے، رویے اور رجحانات وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، ارتقاء پذیر ہوتے رہتے ہیں لیکن پنجابی شاعری ایک ایسے عہد سے بھی گزری ہے جو یہاں کے خطے کے لئے ایک المیہ عہد قرار پایا۔ اور تقسیم کا یہ زمانہ بعد ازاں شاعروں کے یہاں زندگی کیا ایک تجربے کے طور پر شامل ہوا اور اپنے دیرپا اثرات مرتب کئے، شاعری پر، فکشن پر اور ان سے متعلقہ تحریر ہونے والی تحقیق و تنقید پر۔ یہ المیہ عہد یہاں کی شاعری کے لیے دورِ زریں کی حیثیت رکھتا ہے، پنجابی شاعری کے لئے اور دوسری زبانوں کی شاعری کے لیے۔

پنجابی شاعری کا یہ عہد اپنی علیحدہ شناخت اور منفرد پہچان کے حوالے سے ایک خاص مقام پر متعین ہے۔ شاعری کی حد تک یہ پہچان، یہ شناخت یقیناً احمد راہی کی ترنجن، امرتا پریتم کی نویں رت، اور شریف کنجاہی کی جگراتے سے مخصوص ہے۔ خاص طور پر شریف کنجاہی کی نظمیں ''ون دا بوٹا'' ''کھیڈ لے'' ''تیرا پنڈ'' ''پانی بھرن پنہاریاں'' ''ویرتوں کنجاہ دا ایں'' اور دیگر بے شمار نظمیں شاید دیگر بے شمار پڑھنے والوں کی طرح میرے لئے بھی اسی ''جھل'' اسی دیوانگی کے کارن بنی ہیں جس کا اعتراف خود کنجاہی صاحب نے یہ کہہ کر کروایا ہے:۔

''کل کے تے مرداساں
ہن سوچاں تے ہاسا آوے
انج دے جھل وی کرداساں''

آج شریف کنجاہی صاحب پنجابی ادبیات کے منارۂ نور کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ لازم

ہے کہ نووارداں ادب ان کی ذات' فن اور اس سے بڑھ کر زندگی اور ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر سے متعارف ہوں۔ اس کے لئے ان کی شاعری' تنقید اور تراجم کا مطالعہ تو لازم ہے ہی لیکن پچھلے کچھ عرصہ سے ان کے اندر کا محقق بھی پوری طرح بیدار ہو چکا ہے۔ اس لیے اپنے خطوط اور مضامین کے ذریعے تحقیق کا یہ کام وہ پورے تواتر کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور خوشی اور تسلی کی بات یہ کہ انہیں تمام حلقوں کی طرف سے رسپانڈ کیا جا رہا ہے۔ اور یہ لازم بھی ہے کہ شریف کنجاہی کی ذات ان لوگوں اور اس عہد کی ترجمان ہے جو اب ماضی کا حصہ ہیں' جو اب ماضی بن چکا ہے۔ اور ماقبل تقسیم آزادی اور آزادی کے بعد یہاں نشوونما پانے والے نظریات اور ادبی رویوں کا جس تناظر میں وہ مطالعہ کرتے ہیں' اس کے پیچھے کارفرما عناصر کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ ایک عہد ایک زمانے کی نہیں' ایک ایسے انسان کی حکایت بیان کرتے ہیں جس نے زندگی کے ۹۲ برس دنیا کی تاریک اور روشن راہوں پر چلتے ہوئے گزار دیئے اور وہ محض راہوں پر سے ہی گزر نہیں گئے۔ انہوں نے زمانے کے موسموں' اس کے ذائقوں کا گرم سرد چکھا' نشیب و فراز دیکھا' جنگیں دیکھیں اور انسانی روح کے اندر مچلتی امن اور آشتی کی تمناؤں کو محسوس کیا۔ ان کا مطالعہ کیا اور انہیں زمانے کے سامنے بیان کیا۔

ان کا شعری مجموعہ ''جگراتے'' دربی پرنٹنگ پریس گجرات کی طرف سے پہلی بار فروری ۱۹۶۵ء میں چھپا۔ جس کا اہتمام ''ادارہ اشاعتِ ادب'' گجرات کے محمد یوسف صاحب نے کیا۔ یہ ان کے اس شعری مجموعہ کا فارسی رسم الخط میں پہلا ایڈیشن تھا۔ جو ۵۸-۱۹۵۷ء میں انڈیا میں گورمکھی رسم الخط میں چھپ چکا تھا۔ اور جس کو ادارہ کی طرف سے اس اضافی عبارت کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔

> ''شریف کنجاہی کی نظموں کا یہ مجموعہ اسی نام سے کچھ برس پہلے گورمکھی سکرپٹ میں لدھیانہ سے شائع ہوا تھا۔ آج ہم اسی کو اردو سکرپٹ میں شائع کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس خطے کے لوگ بھی اسے پڑھ سکیں کہ ان کے وطن کا یہ شاعر ''جگراتے'' سہہ سہہ کر کیا سوچتا ہے۔''

۱۳۸ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعہ میں ''شریف کنجاہی دی شاعری'' کے نام سے شفقت تنویر مرزا اور ''کنجاہ دا شریف'' کے نام سے منو بھائی کے تفصیلی مضامین بھی شامل تھے۔ جو ''پنجابی گروپ'' لاہور کی محفل میں پڑھے گئے تھے اور جنہیں شریف کنجاہی کی شاعری پڑھنے والوں کے

لیے اس میں شامل کر دیا گیا تھا اور یہ مضامین نہ صرف شریف کنجاہی کی شاعری سمجھنے کے لیے بلکہ اس عہد میں پنجابی زبان و ادب کی تحریک، اس عہد کی سیاسی، سماجی صورت حال اور تہذیبی اور تمدنی رویوں سے آگہی کے لیے معاونت کرتے ہیں۔ شفقت تنویر مرزا لکھتے ہیں: (ترجمہ)

''۴۳۔۱۹۴۲ء کے نزدیک اردو میں جدید نظم کا رجحان اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ان دنوں جن نئے پرانے شعراء نے جدید نظم کی طرف رجوع کیا وہ ایک طرف تو اپنے جذبے کے اظہار میں اس لحاظ سے بھی کامیاب رہے کہ ان کی بات اس زمانے میں اپنے پڑھنے والوں تک پہنچ جاتی تھی۔ اور دوسری طرف وہ ایک نئی راہ نکالنے میں کامیاب دکھائی دے رہے تھے۔ تیسری طرف ان میں سے بہت سارے شعراء کی لکھی ہوئی انہی دنوں کی نظموں کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔ کئی شاعر آج تک اسی زمانے کا کمایا کھا رہے ہیں۔

شریف کنجاہی بھی اسی زبان، اسی طور، ڈھب اور مزاج کے شاعر ہیں۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اس وقت اپنے معاصرین میں وہ کتنے جانے پہچانے تھے لیکن میرا جی کی مرتب کردہ کتاب ''اس نظم میں'' میں شریف کنجاہی کی نظم ''پسپائی'' کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے اور اس نظم کی اپنی جو خوبیاں تھیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اردو میں ہی لکھتے رہتے تو شاید آج ان کا ادبی ''بلا گلا'' زیادہ ہوتا۔''

لیکن انہوں نے پنجابی زبان کو منتخب کیا اور ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھتے رہے۔ اردو سے، انگریزی سے اور دیگر زبانوں سے بھی تراجم کرتے رہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے یہاں بے شمار خیالات و افکار اظہار کے مختلف وسیلوں کی تلاش میں رہے اور انہوں نے اپنی اس تلاش و جستجو کو ممکن بھی بنایا۔ اور منو بھائی کا ''جگراتے'' میں شامل مضمون نہ صرف ان کے شعری رویوں کو سامنے لاتا ہے بلکہ شریف کنجاہی کی شخصیت اور ان کی انسانی رشتوں سے محبت کا آئینہ دار بھی ہے:

''کبھی میں شریف کنجاہی کے ساتھ تین تین چار چار گھنٹے بیٹھا گفتگو کیا کرتا تھا اور بات ختم ہونے پر نہ آتی تھی۔ لیکن راولپنڈی میں پانچ برس رہنے کے بعد اب میں شریف کنجاہی کے پاس زیادہ وقت نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے

اس سادگی اور شرافت سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس کی بے تکلف اور کھلی ڈلھی گفتگو سے ڈر لگتا ہے۔ اس کی اچکن میرے سوٹ کا مذاق اڑاتی اور میری خود اعتمادی آہستہ آہستہ کھانسنے لگ پڑتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں شریف کنجاہی کو "ماڈرن لونگ" کا پتہ ہی نہیں اور لوگ سمجھتے ہیں شاید پورے پنجابی ادب کو "ماڈرن لونگ" کا پتہ ہوتا تو میں سی ایس پی کے مقابلہ میں نہ بیٹھتا۔ شروع میں میں نے کہیں بتایا تھا کہ شریف کنجاہی نے اپنی بے جی کا کہا کبھی نہیں موڑا تھا۔ یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ اصل میں شریف کنجاہی نے اپنی بے جی کا ایک کہا موڑا تھا اور پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسرا بیاہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بے جی کہتی تھیں محمد شریف کا کوئی بیٹا پیدا نہ ہوا تو خاندان کا نام باقی نہیں رہے گا۔ شریف کنجاہی نے کہا خاندان میری بیٹی خالدہ کے بچوں کی صورت میں باقی رہے گا۔ آج خالدہ اپنے نامور والد کی اتنی عزت کرتی ہے جتنی شاید ہی کوئی بیٹی اپنے باپ کی کرتی ہو۔ اور شیرف کنجاہی خالدہ کی بچیوں میں بیٹھا یک بچہ لگتا ہے۔ شریف کا کوئی دشمن نہیں، ہر بندہ پہلی ملاقات میں اس کا دوست بن جاتا ہے۔ ہر شاگرد اس کی عزت کرتا ہے۔ صرف وہ چور اس سے ڈرتا ہے جسے میں خود اعتمادی کہتا ہوں۔ اس خود اعتمادی کا نام اگر محمد شریف ہوتا، میں اسے منو بھائی میں بدل لیتا۔"

یہ دو، دوستوں، دو لکھنے والوں کا نقطہ نظر ہے۔ شریف کنجاہی کے بارے میں، شریف کنجاہی، جو کنجاہ میں پیدا ہوئے، جن پر کنجاہ کو ناز ہے۔ یہ خطہ زرخیز جسے علم و ادب کے حوالے سے "خطہ یونان" قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اس خطے میں موجود یہ قصبہ دو ہستیوں کے طفیل تاریخ میں زندہ جاوید رہے گا۔ ایک شریف کنجاہی کے حوالے سے اور دوسرے غنیمت کنجاہی کی معتبر ذات کے توسط سے۔ غنیمت کنجاہی سے اگر اہل فارس اپنی زبان کی سند لیتے تھے تو اہل پنجاب کے لئے شریف کنجاہی ایک سند، ایک روشن استعارے، ایک معتبر حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جدید پنجابی ادب میں ان کی حیثیت، ان کی اہمیت کیا بنتی ہے، اس کا اندازہ ہمیں پنجابی تنقید، جدید شاعری اور بالحیثیت مجموعی پنجابی ادبیات پر لکھنے والوں کی تحریروں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

نئی تنقید میں ایک اہم نام پروفیسر سرفراز حسین قاضی (مرحوم) کا ہے۔ انہوں نے اپنی ۳۲۰ صفحات پر مشتمل تصنیف ''نویں نظم'' پر مطالعہ کرتے وقت اسے ایک ذیلی عنوان یہ دیا ''شریف کنجاہی توں اقبال صلاح الدین تک' اور اس میں ان کام کنجاہی صاحب کی شاعری پر مبسوط' مربوط اور بھرپور مضمون جو ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ شری ف کنجاہی صاحب کی شاعری اور خاص طور پر نظم کا ہر پہلو سے جائزہ پیش کرتا ہے۔

''شریف کنجاہی کا مرتبہ جدید نظم میں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی شاعری ایک صاف اور واضح نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ ان کے پاس ایک نصب العین ہے' وہ ایک مخصوص اسلوب اور طرز ادا کے مالک ہیں۔ انہیں ماورائی اور غیر فطری باتوں سے قطعاً دلچسپی نہیں' انسانی زندگی اور اپنا معاشرہ ان کے سامنے ہے۔ وہ اس میں سے ہی دکھ سکھ' ہنسی' آنسو' درد اور خوشیاں تلاش کرتے ہیں انسانی زندگی کا ماضی اور مستقبل ان کے لئے ایک سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ اس میں سے حسن تلاش کرتے ہیں۔ ہندوستان کا مشترک معاشرہ' اس میں پنپنے والی مختلف تحریکیں' مختلف النوع عقیدے اور خیالات نے شریف کنجاہی کو حساس بنا دیا ہے۔ ماضی ادھڑا ہوا اور مستقبل بنا کسی ضمانت کے بکھرا نظر آتا ہے۔''

یہ وہ خیالات ہیں جن کا اظہار پروفیسر سرفراز حسین قاضی نے شریف کنجاہی کی نظموں کے عمیق مطالعہ کے بعد کیا ہے۔ اور یہ حسن ہے ان کی شاعری کا کہ جہاں وہ داخلی واردات اور اپنی قلبی کیفیات کو بھی نظم کا موضوع بناتے ہیں' وہاں پر بھی خارج اور دنیا ان کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''تیرا پنڈ'' کی درج ذیل سطریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس نظم کا ایک سطح پر تو یہ حسن بنتا ہے کہ کنجاہی صاحب نے لفظوں کے بیان کو نہایت سادہ رکھا ہے۔ دوسری سطح اس میں ان تہذیبی' ثقافتی اور معاشرتی عناصر کا موجود ہونا ہے اور تیسرا' انسانی رشتوں میں سرایت کر رہی اس بے ثباتی کا ذکر ہے جو نوعِ انسان کا اول سے مقدر ٹھہری ہے۔ نظم کے مصرعے دیکھئے:۔

اج اوس پنڈ دے میں کولوں لنگھ چلیاں
جتھوں کدے ہلنے تے دل نئیں سی کردا

جتھے میوں نت پیار ہندا کوئی کم سی
کم کیہ سی۔۔۔۔۔۔ سچی گل اے جتھے تیرا دم سی
تیرے دم نال پنڈ جج والی تھاں سی
کیڈا سوہناناں سی
اوہدا نان سندیاں ای جان پے جاندی سی
دیدا اوہدی اکھیاں نوں ٹھنڈا پڑ اندی سی
دوروں رُکھ تک کے تھکیویں لہہ جاندے سن
باہیں مار مار کے اوہ اج پنے بلاندے سن
سورگ دا سواد آوے جتھاں بیٹھ کھلیاں
اج اوہناں رُکھاں دے میں کولوں لنگھ چلیاں
اج میرے پیراں نوں نہ چھج کوئی ہوندی اے
پنڈولوں آئی وا، پنڈے نوں نہ پوہندی اے
کسے دیاں چاواں میرا راہ نئیں ڈکیا
کوٹھے اتے چڑھ کے تے کسے نئیں تکیا۔۔۔"

یہ نظم زندگی کے ان منظر ناموں کی داستان سناتی ہے جب شریف کنجاہی نے انسانی محبت اور انسانی محبت پر استوار رشتوں ناتوں میں دراڑیں پڑتی محسوس کیں۔ اس سے آگے کا سفر شاعری میں اور دوسری تمام اصناف میں اجنہیں انہوں نے اپنے اظہار کے لئے منتخب کیا' اس داستان موجود کرداروں کی کہانی ہے۔ اور ان کرداروں کی زبانی ہے اور انسانی محبت' اخوت اور بھائی چارے کے لئے دنیا میں جہاں جہاں کسی رہنما دانش ور اور شاعر ادیب نے جدوجہد کی' شریف کنجاہی اس انسان کی بات سنتے ہیں' اس سے اپنی داستان کہتے ہیں۔ انسانی دکھ کے لئے علاج کی تلاش میں نظر آتے ہیں اور اس عظیم انسانی ثقافتوں کی حامل زندگی کے احیاء کی جدوجہد میں مصروف کار دکھائی دیتے ہیں۔ جو مشینی دور نے انسان سے زبردستی چھین کر اپنے قبضۂ قدرت میں کر لی ہے۔ یہاں وہ شاعری کو ذریعہ بناتے ہیں اور وہ بھی پنجابی شاعری کو لیکن یہاں بھی مراد ان کی عظیم تر انسانی اقدار کی بحالی ہے۔

"دل آکھے ایہہ نسریاں کنکاں

پکیاں ہوئیاں فصلاں
تیویاں جیہاں کولوں
منگن روپ ادھارے
مڑ ساونی دیاں کنکاں
پیروں پیروں وی اُچے ٹانڈے
لچک لچک سرواں نوں شرماندے
آسے پاسے لگیاں ہوئیاں گڈھ گڈھ نالوں لمیاں چھلیاں
ڈھاکے لاکے بال ایانے ہون جویں مٹیاراں کھلیاں
کیہ ایہناں تے اساناں توں وسن گے انگیارے
مولا خیر گذارے۔۔۔۔۔''

شریف کنجاہی صاحب کے یہاں زندگی اپنے گہرے مشاہدے مطالعے اور تجربے کے امتزاج سے جنم لیتی ہے۔ ان کے پاس وہ تخیلاتی قوت ہے جو انہیں ان دیکھی اشیاء کے موجود و غیر موجود معانی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں اور اس عہد حسن و خواب میں دیکھتے ہیں۔ جب چار سو امن ہے ہریالی ہے فصلیں لہلہا رہی ہیں ان کے خوشوں کی مہک ہر طرف بکھری ہے۔ لیکن وہ اپنی حسیات اپنے شعور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ انسان جو اسلحوں کی منڈیاں آباد کرنے میں مصروف ہے اور فطرت کی آماجگاہوں پر قبضہ کرنے کی خواہش میں نظر آتا ہے' ماحولیاتی نظام کو درہم برہم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کوئی وقت جاتا ہے کہ قدرت کے اور فطرت کے بھیانک اور گھناؤنے انتقام کا شکار ہونے والا ہے۔۔۔۔۔ الہام کی طرح شاعری میں برسوں پہلے کی ہوئی شریف کنجاہی کی باتیں آج حقیقت کا روپ دھار رہی ہیں۔ اور تلخ سچائی کا لبادہ اوڑھ رہی ہیں' جس میں حقیقت کا سامنا کرنے اور سچائی کو دیکھنے کی ہم میں ہمت ہے نہ طاقت:

''کیہ ایہناں تے اساناں توں وسن گے انگیارے
مولا خیر گذارے۔۔۔۔۔''

شریف کنجاہی کی ذات' ان کی فکر' فن اور نظریات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تجریدی اور استعاراتی پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے زندگی کو اس کے مستند معانی میں دیکھا ہے اور حقیقت کو حقیقت اور حقیقت مطلق ہر دو حوالوں سے بیان کیا ہے۔ ان

کے یہاں پر لطف احساسات کے رس سے بھری زندگی بھی موجود ہے اور اس حسن کو درپیش موت کا خوف بھی۔ تاہم ان کا حسن نظریہ ہے کہ وہ ان کے بیچوں بیچ زندگی کی اور زندگی کے حسن کی نمو دا س کی نشوونما ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ جدید اردو اور پنجابی شاعری اور تنقید میں ایک اور اہم نام عارف عبدالمتین کا ہے۔ ان کی تنقیدی کتاب ''پرکھ پڑچول'' کو اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے جس میں انہوں نے صوفیانہ شاعری، ماقبل جدید عہد کے پنجابی شعراء اور جدید پنجابی شعراء کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

شریف کنجاہی کے شعری مجموعہ ''جگراتے'' ''صحت مندانہ نظریات کی فنی تفسیر کے زیر عنوان کنجاہی صاحب کی ذات کے حوالے سے گفتگو بڑھاتے ہوئے ان کی شاعری کا انسانی جذبات و احساسات کے تناظر میں یہ مطالعہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

''اردو کے جن پڑھے لکھے شعراء نے پنجابی شاعری کی طرف عملی طور پر توجہ دی، اس کے محدود فکری افق کو وسیع کیا، ان میں شریف کنجاہی کا نام بہت نمایاں ہے۔۔۔۔۔ وہ پنجابی شاعری کی طرف آنے سے پہلے اردو شاعری کو کتنے ہی اعلیٰ پائے کی نظمیں دان کر چکے اور ان کے وقار میں اضافہ کر چکے تھے۔ اور اپنے پڑھنے سننے والوں سے اپنے ان ملے شعور کا اعتراف کروا چکے تھے۔ اس لئے وہ جب پنجابی شاعری کو اپنی نازک، لطیف اور گہری نظموں سے مالا مال کرنے لگے تو لوگوں کو ان کی آواز جانی پہچانی لگی۔ کیونکہ ان میں بھی اسی البیلی شخصیت کا روپ نمایاں تھا۔ جو اردو نظموں میں اپنا حسن دکھا چکی تھی۔''

پھر شریف کنجاہی کی شاعری میں موجود نمایاں وصف اور اہم عنصر انسانی رویے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یوں تو شریف کنجاہی ساری انسانیت سے ہی محبت رکھتے ہیں اور اس کی ترقی کے آرزومند ہیں لیکن ان کی محبت اندھی نہیں، بلکہ بیدار ہے اور ظالم اور مظلوم کے فرق کو پہچانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبقاتی معاشرے میں وہ اپنی محبت کو یہ روپ بخشتے ہیں کہ وہ مظلوم کی حمایتی بن جاتی ہے۔ حاکم کے مقابلے میں محکوم کو ترجیح دیتی ہے۔ اور جابر کی طرف سے منہ موڑ کر مجبور کی

طرف ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کی کامیابی کی آرزو ہی نہیں پالتی بلکہ اس
کی جدوجہد میں شریک بھی ہو جاتی ہے۔ تاکہ وہ دن جلد آئے جب سب
کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ اور اپنی انسان دوستی کے طفیل اونچ نیچ کی یہ شطرنج
ختم کر کے جگ پر عالمگیر محبت کی حکومت قائم کر دیں گے۔ شریف کنجاہی
کی نظم ''مہیٹ'' میری ان معروضات کی عملی تائید کرتی ہے' نظم دیکھئے:۔

پر ایہہ سمجھ نہ کدے جہان اتے گڈیاں چڑھ کے نئیں اسمان رہیاں
لے کے پوری چرکلی ڈور مڑ دی اساں تکیاں تے تھلے آن پئیاں
ٹنڈاں کھو دیاں والا معاملہ اے بھریاں جاندے او کدوں تیک رہیاں
مکدی گل جے ہن نئیں جرن جوگے بڑا چر جریاں بڑا چر سہیاں
کدوں تیک سوار و سوار چلسی اوڑک بیٹھلی اتے وی آونی ایں
اساں مدتاں دے ہوئے دیندیاں نے مہیٹ لے کے کھیڈ مکاونی ایں''

نظم کے مطالعہ کے بعد عارف عبدالمتین کی رائے سے کلیتاً اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ شریف کنجاہی
ہر وقت ایک تبدیلی کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور یہ تبدیلی اس سوچ' اس رویے کی تبدیلی ہے
جس نے انسانوں میں طبقات اور عدمِ مساوات کا جابرانہ اور غاصبانہ نظام قائم کر رکھا
ہے۔۔۔۔۔ شاعری کا یہ سماجی منصب' اس کا معاشرتی کردار اور اخلاقی فرض ہے' جس کا تعین
وہاں کے لوگ' وہاں کے لوگوں کی رائے سے ترتیب و تشکیل پاتا ہے۔

شاعری ایک اور فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے اور یہ فریضہ ہے' جس کی جانب عظیم انگریزی کے
شاعر اور دانشور ورڈز ورتھ اشارہ کر رہے ہیں:۔

''شاعری طاقتور جذبوں کا ایک ہنگامی اور اضطراری بہاؤ ہوتی ہے۔ اس
کی اساس ماضی میں کارفرما وہ جذبات و احساسات ہوتے ہیں جنہیں
اچھے دنوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ شاعر ان جذبوں پر غور و خوض کرتا ہے۔
آخر میں ایک ردِ عمل پیدا ہوتا ہے' جس کے کارن وہ خود تو نظروں سے
اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان کی جگہ نئے جذبے لے لیتے ہیں
۔۔۔۔۔۔ اور یقیناً آئندہ زمانوں کے بطون میں خفتہ لفظوں کا یہی وجود
ہوتا ہے جو بعد میں شعری صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اب یہ اس شاعر پر

منحصر کرتا ہے کہ وہ اسے کس سطح پر رہ کر اور کس درجہ کمال ہنر وری سے بیان کرتا ہے اور اس کے لفظ اسلوب اور موضوع میں کتنے زمانوں اور کتنے لوگوں کے مسائل و معاملات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اور ان مسائل و معاملات کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

جس طرح کہ زمانے کی تاریخی حقیقتیں ہمارے سامنے ہیں۔ انہوں نے جدید عہد کے شاعر سے یہ تقاضا کیا کہ وہ رومانویت اور ابہام وگمان کی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ اور انسان کو جن مادی روحانی نفسیاتی اور بدامنی کے عفریت نے اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ لیا ہے اس کو اپنا موضوع بنائے اور اگر زمانے کے چلانے والے اس کا کوئی حتمی اور دیرپا حل نہ بھی تلاش کر سکیں تو کم از کم انسانی کتھارسس کے اسباب مہیا ہوسکیں۔"

یہی وجہ ہے کہ جدید شاعروں نے زندگی کو اور زندگی کی مثبت قدروں اور عظیم اخلاقی قدروں کو اپنا موضوع بنایا۔ ان شاعروں میں شریف کنجاہی کا نام ان محدودے چند شعراء میں شامل کیا جا سکتا ہے جن کے یہاں زندگی صبح کی دہلیز پر کھلے مہکتے گلاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود پنجابی شاعری کے حوالے سے شریف کنجاہی صاحب کی اپنی رائے کیا ہے؟ اس کا اظہار انہوں نے پاکستان پنجابی شاعری کے ابتدائیہ میں ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"پنجابی شاعری کا بیلا (سماں) شاید اتنا ہی قدیم ہو جس قدر قدیم اس کا تہذیبی نظام ہے۔ پر لگتا ہے کہ وقت نے بہت سے درختوں اور ان کی شاخوں پر بور پڑنے اور پھول کھلنے سے پہلے ہی انہیں خشک کر دیا اور پھر بعض لوگوں کو جب اس طرف رجوع کرنے کا خیال آیا ان کو ون کا ایک بوٹا ہی نظر آیا' جسے آج ہم بابا فریدؒ کے نام نامی سے یاد کرتے ہیں ان کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے کئی نقوش اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ایک تو بابا جی نے خدا سے لو لگانے کی بات کی تھی اور دوسرا یہ کہ دنیا فانی ہے۔ جس سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ دنیا کے بھی ذائقے فانی ہیں' اور ان ذائقوں کے لیے انسان کو آپس میں الجھنا نہیں چاہئے۔"

اور بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ شریف کنجاہی صاحب نے بابا جی کی یہی آخری بات پلے باندھ لی

اور انسانی قدروں کے پرچارک کے طور پر ادب کے میدانِ عمل میں آن اترے۔ اور پھر نہ صرف شاعری ہی میں بلکہ تنقید اور تراجم کے لئے بھی ان کتابوں کو اہمیت دی جوان کے اس انسانی رویوں کے حامل نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں اور قدیم اردو شاعری کی طرح وہ جدید نظم اور جدید نظم نگاروں میں بھی یہی رویہ نمایاں دیکھتے ہیں:

''پچھلی دہائی میں پاک پنجاب کی پنجابی شاعری کو ہم روایت سے جدت کی طرف سفر قرار دے سکتے ہیں۔ لمبی قافیے والی نظم سے چھوٹی اور بے قافیہ بتر کی طرف آنے سے اس میں موضوعات بھی نئے نئے شامل ہو گئے۔ پہلے جب اس صحن میں کوئی لڑکی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اب اس کے لیے دروازے کھلنے لگے۔ تعلیم کے لیے وہ خود بھی قید سے آزاد ہوئی اور پنجابی شاعری کا کسی نہ کسی رنگ میں اُن کے انگ سنگ ہوگئی۔ چاہے اس حوالے سے ہمیں حکیم ناصر اور احمد ظفر راہیں ہموار کرتے نظر آتے ہیں یا پھر اس مہمان کو منیر نیازی نہایت خوبصورت طریقے سے جی ایاں نوں کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے شعری مجموعہ ''سفر دی رات'' کی چالیس نظموں میں سے سولہ میں ہمارا سامنا کسی نہ کسی طرح کسی لڑکی سے پڑتا ہے۔''

اگرچہ یہی رنگ کم و بیش شریف کنجاہی کی نظموں میں بھی گہرا ہے۔ تاہم ان کے یہاں موضوعاتی تنوع اور وسعت نظر آتی ہے اور خاص طور پر ان کے بعض گیتوں، نظم ''کھیڈ لے' دیر توں کنجاہ دا ایں'' اور خاص طور پر ان کی نظم ''پانی بھرن پنہاریاں'' قابلِ ذکر ہے۔ ان نظموں میں ایک طرف پنجاب کا پورا ثقافتی منظر نامہ نظر آ رہا ہے تو دوسری طرف عورت کی تقدیر میں شامل صدیوں سے اس پسپائی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جو ابھی تک تخلیقات کا موضوع چلی آ رہی ہے۔ اور پھر نظم میں وہ آنگ اور ردھم اور لوک وزڈم بھی بدرجہ اتم موجود ہے جو قدیم پنجابی فوک گیتوں اور وک شاعری کا خاصا رہا ہے۔ نظم دیکھیے:

''پانی بھرن پنہاریاں تے وَنو وَن گھڑے
بھریا اس دا جانیے جس دا توڑ چڑھے
او ہوئے چڑ کلی او ہو کھوہ دا گھیر
اک بھنے اک بھرلے ایہہ لیکھاں دا پھیر

لیکھاں دی سبھ کھیڈ ہے جدوں ایہہ دیندے ہار

لکھاں سگھڑ سیانیاں بھنن ادھ وچکار

بکھنے گھٹ گھٹ بھیاں تے نویاں لیائیاں لج

جس دا بھجنا لکھیا اس دا جاندا بھج

اس دی ڈھاک اج سلھنی جس نے بھریا کل

اج وہ مورکھ بن گئی کل جس نوں سی ول

تکیاں مان کریندیاں اساں گھاگھے ہتھ پھڑے

پانی بھرن پنہاریاں تے ونو ون گھڑے''

قطع نظر اس کے اس نظم میں ایک درد کی لے اور ایک مستقل غم کا آہنگ موجود ہے۔ ان کی نظم ''کھیڈنے'' اس سے آگے کی ایک جذباتی پرت ہے۔ جو پورے پنجاب کے لیے نہیں پوری دنیا کی بیٹیوں کے لیے کہی گئی محسوس ہوتی ہے۔ ''شریف کنجاہی انکار سے اقرار تک'' کے مصنف غفور اسلم نے جب اس نظم کے حوالے سے شریف کنجاہی صاحب کی صاحبزادی خالدہ یوسف صاحبہ سے پوچھا تو انہوں نے ان کے جواب میں وہی الفاظ ادا کیے جن کی ان سے توقع کی جا رہی تھی انہوں نے کہا:

''اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر اب سوچتی ہوں کہ شاید ابا جی کی چھٹی حس نے ان سے یہ نظم لکھوائی ہو۔ اور انہیں پتہ تھا کہ آگے چل کر اس کے ساتھ کیا ہونا ہے۔ والدین اپنی اولاد کے مثبت سوچ رکھتے ہیں۔ اچھی سوچ رکھنے والے والدین کے ذہن میں وہ بات بعض اوقات قبل از وقت آ جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بچوں کو پیش آنے والی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شاید انہیں بھی اندازہ ہو گیا ہوگا اور انہوں نے یہ نظم لکھی ہوگی''

''کھیڈ لے میرئیے بھولیے دھیئے

کھیڈ لے گڈیاں نال

اپنیاں ضداں اڑیاں وی منوا لے چار دیہاڑے

تیرا راہ مل بیٹھے ہوئے نیں کنے وخت پواڑے

کنے دکھ جنجال

کھیڈ لے چھیتی کھیڈ لے گڈیاں نال

وگدیاں نیں اس بُوہ وچ دھیئے تتیاں تتیاں لو آں
مینوں ڈرائے تیریاں ہاسیاں جھبدے ای جھوں جاناں
اکھاں گھیر نوں پہلاں تیریاں سدھراں نے سوں جاناں''

عورت ذات ------ایہہ جیون پینڈا
تھاں تھاں نیں ٹوئے
تھاں تھاں کنڈے بچھے ہوئے
تیری بے فکری دے لیڑے ہوسن لیراں لیراں
پراوہ ویلا جدآ وناایں ۔۔۔۔ آجاناایں
اج کیوں چنتا کریئے
اج کیوں ہوکے بھریئے
خورے اس ویلے نوں ساڈیاں پرتن چا تقدیراں
بدلن جیون چالے
اس کر کے
توں لمیاں سوچاں لانبھے دھر کے
میریئے بھولیئے دھیئے
کھیڈلے گڈیاں نال''

اگرچہ زندگی کی جمالیات جس کا خمیر کائنات کے جملہ عناصر سے ترتیب پاتا ہے' شریف کنجاہی صاحب کی نظموں کا مرکزی استعارہ ہے اور خوف اور غم کی وہ اٹوٹ سرحد' جس کی جانب انسان کے دم دم سفر کرنے کی خبر دی گئی ہے' یونہی محسوس ہوتی ہے کہ بس اب ایک قدم' ایک سانس اور ایک آنسو کے فاصلے پر موجود ہے اور درمیان کا یہ فاصلہ ہی خوشی کا زمانہ ہے اور خوشی کے اس مختصر زمانے سے انسان حسن کی' خیر کی اور امن کی کھیتی کاشت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اور پھر اس کھیتی پر ایک دن بور پھوٹتا ہے' پھول کھلتا ہے' اس میں بیج پڑتا ہے' انسان کو اس کی محنت کا ثمر ملتا ہے۔ اسی داستان کو' اسی واردات کو شریف کنجاہی صاحب پچھلے اکیانوے برسوں سے سمجھنے اور ان گنت برسوں سے سمجھانے کی جستجو میں نظر آتے ہیں۔۔۔۔ اور اس سعی میں ان کی اپنی صورتِ حال کیا ہے۔ اس

کو سمجھنے کے لئے ان کی اردو نظم کے یہ مصرعے پڑھنے کی ضرورت ہے' جس میں انہوں نے اپنی ذات بتا کر پورے انسانیت کے معنی لیے ہیں

لوحِ دل کو میں نے دھویا بار ہا

بار ہا اس پر ملی ہے گا چنی

لیکن اس پر کچھ حروف ایسے بھی تھے

جو وجود لوح کا حصہ بنے

اور پڑھے جاتے ہیں اب بھی صاف صاف۔۔۔۔''

یہ حروف' جو آج بھی واضح ہیں' جو آج بھی صاف شفاف ہیں' جو آج بھی پڑھے جا سکتے ہیں' دراصل ان کی اپنی زندگی کا قصہ ہیں۔۔۔۔۔ اور اپنی زندگانی سے کشید کیے گئے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہیں۔ کہ زندگی کی' کائنات کی' کائنات میں آباد انسان کی اور انسان میں موجود انسانیت کے اس قصے کا اصل اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اور ایک شاعر' ایک فنکار جب تک وہ سب رنگ اپنے فن' اپنے آرٹ میں نہیں بکھرا دیتا' اور ان کی نمود اپنے خونِ جگر سے نہیں کرتا' اس کے اثرات نہ ہی دیرپا ہوتے ہیں اور نہ اس میں انسانیت بھر وسعت پیدا ہوتی ہے۔ شریف کنجاہی صاحب کی اپنی زندگی سے جڑی اولین عمر کی یادیں بھی تخلیق کا موجب بنی ہیں اور اپنی تخلیقات میں برابری' مساوات اور انصاف کے عنصر درحقیقت ان کی اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

''جب میں اپنی یادوں کو ری کولیکٹ کرتا ہوں تو سیاست میرے نزدیک حالات سے بد دل اور مایوس ہونے کا نام ہے۔ جو آدمی اپنے حالات سے بد دل نہیں ہوتا یا مایوس نہیں ہوتا وہ اس طرف نہیں آتا۔ سیاست کا شوق میرے اندر ایف اے کی تعلیم کے دوران پیدا ہوا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ حالات نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں ایف اے تعلیم کے دوران یہ سب کچھ سمجھا کیونکہ میں نے ایف اے کر لیا لیکن اس سے آگے پڑھنا میرے وسائل میں نہیں تھا۔ چونکہ گجرات میں ایف اے تک ہی کالج تھا' پڑھنے کے لئے گجرات سے باہر میں نہیں جا سکتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اندر ایک فرسٹریشن سی پیدا ہو گئی وہ یہ تھی کہ میرے والدین کا فرض

ہے کہ وہ مجھے پڑھانے کے لئے وسائل پیدا کریں' جوان کے بس میں نہیں تھا۔ ان دنوں بیکاری بہت تھی اگرچہ پڑھنے لکھنے والے بہت کم تھے اور لوگ پڑھنے کے بعد کہیں بھی صحیح طور پر ایڈجسٹ نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اندر ایک بغاوت سی پیدا ہو گئی۔ اب بھی جب میں ان حالات کا احاطہ کرتا ہوں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے معاشرے نے یا حکومت نے وہ سہولت نہیں دی جو میرا جائز حق تھا۔۔۔۔۔۔''

لیکن شریف کنجاہی صاحب نے وہ تمام حقوق جو ایک معاشرے نے ایک تمدن نے ان پر واجب کیے انہیں پوری دیانت داری کے ساتھ بروقت طور پر ادا کیا۔ وہ شریف کنجاہی صاحب جن کی ادبی تربیت میں حفیظ جالندھری جیسے عظیم شاعر کا کردار نمایاں نظر آتا ہے اور جس کا وہ جا بجا اعتراف کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ شریف کنجاہی صاحب جن کی فکری' فنی اور تہذیبی گفتگو' مکالمہ اور بحث وتمحیث علی عباس جلالپوری جیسے فلسفی اور دانشور سے رہی ہو۔ جن کے ساتھ علم دوستی کا رجحان مشترک ہونے کے باعث لائبریری میں کتابیں پڑھتے رہے ہوں۔ اور پھر ایک وقت میں پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی کا ڈیپارٹمنٹ شروع ہوا تو ان دونوں مشاہیر کو پنجابی زبان و ادب کی تعلیم اور اس کے فروغ میں بھی باہم مل کر کام کرنے کا موقع ملا ہو۔ اس کے یہاں یہ سارا کچھ نظر نہ آتا تو کیسے؟

انہی دنوں میں شریف کنجاہی صاحب علامہ نیاز فتح پوری کے خیالات کے زیر اثر بھی رہے۔ مشکل پسندی کے اس زمانے میں انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ تاہم انہوں نے اپنی فکر پر علامہ مشرقی' مولانا ابوالکلام آزاد' تھامس ہارڈی' گورکی' برٹرینڈ رسل اور پرنس کروپاٹکن کے اثرات کا ذکر بھی برملا کیا ہے۔ اسی طرح کنجاہی صاحب نفسیات کو اپنا پسندیدہ ترین موضوع قرار دیتے ہوئے فرائڈ کو بھی اور ''ژنگ'' کو بھی اپنے افکار وخیالات کا محور قرار دیتے ہیں۔ پنجابی میں شاہ حسینؒ اور میاں محمد بخشؒ انہیں اپنی فکر کے قریب تر نظر آتے ہیں۔۔۔۔!!

یوں اگر ہم اس شریف کنجاہی کا تجزیہ کریں جو ان عظیم ہستیوں کو اپنے زادِ راہِ زیست اور اپنی فکر کے لئے روشنی کا وسیلہ سمجھتے ہیں تو ہمیں ایک ایسے شریف کنجاہی کی ذات سے مکالمہ کرنا ہوگا جو انسانی زندگی کو انسانی تہذیبوں اور ان تہذیبوں کو تشکیل دینے والے دانشوروں کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ اور یہ خواب دیکھتا ہے کہ آسمانی صحیفوں میں

جس انسانی مساوات کی بات کی گئی ہے اسے قائم کرنا کسی مقدس فریضے سے کم نہیں۔ اور اس کی تائید میں شریف کنجاہی صاحب نے کروپاٹکن کی کتاب میں لکھے ہوئے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہر انسان کو ضروریات زندگی کی سہولیات میسر ہونا چاہئیں۔ وہ کام کرے یا نہ کرے۔

اگرچہ یہ ایک عجیب وغریب فلسفہ ہے لیکن یہ انسانی فلسفہ ہے۔ اور اس فلسفے کو شریف کنجاہی صاحب نے اپنی ابتدائی اردو نظموں میں سے ایک نظم کے کچھ مصرعوں میں یوں بیان کیا ہے:۔

"دل تو چاہتا ہے پہناؤں تجھے پھولوں کے ہار
آسمان کے چاند تارے اپنے آنسو اپنے گیت
سب کروں تجھ پہ نثار
ساتھ یہ ڈر بھی ہے بدنام ہو جائے گی
جب کبھی مشرق سے ابھرے آفتاب انقلاب
وقت کی گاڑی تری دہلیز پر آ کے رکے"

اگرچہ یہ ایک عورت کے لیے ہے' لیکن ایک عورت بھی تو انسان ہے اور بطور انسان عورت کی توقیر اس کی عظمت کا اعتراف' اس اعتراف کی خواہش ہی شریف کنجاہی کی شاعری کا بنیادی نقطہ ہے اور یہی نقطہ ان کی شاعری کا نقطۂ آغاز بھی ہے کہ ان کی نظم "پسپائی" جو بعد ازاں انہوں نے "سرینڈر" کے نام سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہونے والے اپنے شعری مجموعہ "ستارہ سحری" میں شامل کی۔ جس پر اردو کے منفرد اور صاحب اسلوب ادیب محمد خالد اختر کا انگریزی ریویو پڑھ کر پنجابی کے اہم تر کہانی کار اور ڈرامہ نگار سجاد حیدر نے انہیں دو بے حد خوبصورت اور پذیرائی سے بھرپور خط لکھے۔ یہ نظم "پسپائی" کہ جو حلقۂ ارباب ذوق کے میراجی کے انتخاب میں شامل ہوئی جو ان کی ذات کے لیے منفرد حوالہ بنی اسے آج بھی پڑھیں تو اس میں معانی کے وہی اسرار پوشیدہ ہیں۔

"کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں امیدوں کو
کیوں جلاتے ہو مرے دل میں چراغ
میں نے سارے ہی دیئے آج بجھا ڈالے ہیں
آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے
جس طرح جنگ کی راتوں کو
بڑے شہروں میں بتیاں خود ہی بجھا دیتے ہیں
زندگی کے سب آثار مٹا دیتے ہیں

میں نے یہ سارے دیئے آپ بجھا رکھے ہیں
آسمانوں پہ کئی دشمن جاں طیارے
انہی شمعوں کا نشانہ رکھ کر
بم گراجاتے تھے اور آگ لگا جاتے تھے
ان کو خاموش ہی تم رہنے دو
دل کی دنیا میں تم اجالا نہ کرو
میری امیدوں کو بے ہوش پڑا رہنے دو
تم نہیں مانو گے تم دیکھتے ہی جاؤ گے
اچھا دیکھو نہ مرے سینے کے چراغ
دل کی دنیا میں چراغاں کردو
پھر مرے جینے یا مرنے کا ساماں کردو۔۔۔۔"

اوراب اس خط کا حوالہ جو "ستارۂ سحری" میں ریویو پڑھ کر سجاد حیدر صاحب نے لکھا:۔

"آج صبح یہاں کا اخبار "نیوز" پڑھنے لگا تو اس میں آپ کی نئی کتاب "ستارۂ سحری" پر برادرم محمد خالد اختر کا بڑا دل پسند اور پرخلوص ریویو پڑھا۔ آپ کے مجموعہ میں سے تین چار نظموں کا انگریزی ترجمہ بھی انہوں نے ایسے کیا ہے کہ ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے۔ تبصرہ پڑھ کر آپ کی دلوں پر راج کرنے والی محبوب شخصیت یاد آ گئی اور میں نے آپ سے آدھی ملاقات کا بہانہ اس خط کو بنایا۔۔۔۔۔ ریویو کا تراشہ اس خیال کے ساتھ بھجوا رہا ہوں کہ کہیں آپ کی فائل میں لگا رہے گا۔۔۔۔۔

آپکا دوست

سجاد حیدر

کتاب ملنے پر جو خط سجاد حیدر صاحب نے انہیں لکھا درحقیقت وہ سچا اور کھرا تجزیہ ہے اور طرح سے ٹریبیوٹ بھی۔ جو ایک بڑے لکھنے والے نے دوسرے بڑے لکھنے والے کو پیش کیا ہے۔ خط میں سے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

"برادرم مکرم شریف صاحب السلام علیکم

آپ کا بیش قیمت تحفہ ملا۔ کسی شاعر کے لیے اپنے کلام کا مجموعہ دینا

ایسے ہی ہوتا ہے جیسے اس نے اپنے سینے میں سے دل نکال کے پیش کر دیا ہو۔ پھر یہ آپ جیسے اعلیٰ اور سچے شاعر کا شعری مجموعہ ہے۔ جو دھڑکتا ہوا دل بھی ہے اور شجر الدر بھی۔۔۔۔

پچھلے چار دنوں سے آپ کی نظمیں پڑھ رہا ہوں اور کئی نظموں کو پڑھتے ہوئے اندر سے ''ہُو'' کا آوازہ آتا ہے۔ تب میں کتاب ٹھپ کر ایک طرف دھر دیتا ہوں۔ کیونکہ میرا دل بھی دیوانہ ہے اور آپ جانتے ہیں۔۔۔۔''دیوانہ اے راہو بس است''

آپ نے اس سیلاب کو بہت دیر تک تھامے رکھا۔ یہ دلوں کی دھرتی کو سیراب کرنے والا سیلاب تو بہت پہلے دھرتی پر سے گزر جانا چاہئے تھا۔ جب اس دھرتی کے ساتھ یہاں کے بسنے والوں کے سینے بھی چاک ہوئے تب یہ ہُوکے یہ آہیں تنکوں کی آگ بن کر دھوئیں کے ساتھ اجاڑ بستیوں سے اٹھنا چاہئے تھے۔ جب ہمارے بچوں کو جنگلوں کی بیگار پر بھیجا جا رہا تھا۔ یہ چیخیں تو تب سینہ پھاڑ کر باہر آنا چاہئیں تھیں۔ آج کا پڑھنے والا تو مطمئن ہے۔ اسے یہ تنگ گھاٹیاں اور اس طویل سفر کی کیا خبر' جس سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں' پر شاید آپ کی نظمیں میرے جیسے پرانے آدمی کو جڑوں سے ہلا سکتی ہیں اور ان نئی رُت کی شاخوں کے چہرے تک بھی دُور کی آگ کی تپش پہنچا دیں۔''

یہ خط ابھی اور بھی طویل ہے اور اس میں انہوں نے شریف کنجاہی صاحب کی بعض نظموں کے حوالے بھی دیئے ہیں اور پوری طرح ڈاکٹر اسلم رانا کی اس رائے سے متفق ہوتے نظر آتے ہیں جو انہوں نے ''ستارۂ سحری'' کے حوالے سے ظاہر کی ہیں:

''ستارۂ سحری'' سحری سویر کی نوید بن کر طلوع ہوتا ہے۔ یہ کبھی غروب نہیں ہوتا بلکہ اپنی روشنی مشرق کی کوکھ سے جنم لینے والے ابھرتے ہوئے سورج کو ودیعت کر کے خود کائنات کے ازلی و ابدی نظامِ شمسی کے حوالے سے ہمیشہ روشن اور درخشندہ رہتا ہے۔''

شریف کنجاہی سے مل کر ان کی گفتگو سن کر ان کی تخلیقات کا مطالعہ کر کے اور ان تخلیقات میں

زیریں لہر کی مانند چلتی فکر ونظر کی گہری دبیز اور بھرپور روشن لکیر سے آنکھیں ملا کر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ یہ "ستارۂ سحری" دراصل شریف کنجاہی صاحب کی دراصل اپنی ذات ہے۔ یہ ذات جو نہ صرف اپنی زمین اور اس پر آباد لوگوں کے لیے محبت اور دیرپا امن کی آرزومند ہے۔ بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے یہی آرزو یہی جستجو رکھتی ہے۔ اس وقت کہ جب وہ زندگی کو عالمگیر انسانی قدروں کا حسین مرقع بنانا چاہتے تھے۔ اس وقت الجزائر میں' انگولا میں' کانگو میں اور ویت نام میں انسان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس دوران ان کی "الجزائر" پر لکھی ایک پنجابی نظم کا ترجمہ:

"بدتدبیر شاخیں کاٹیں' پھول توڑیں
بدتدبیر لوگ!

درختوں پر روپ نہ چاہیں
اور جب پھر بھی شاخیں پھوٹیں
پھر سے شاخوں پر پھول کھلیں
یہ تنگ پڑیں اور اور سر جوڑ بہیں (بیٹھیں)
انہیں کون سمجھائے
یوں ریت کی فصیلوں سے
تیز پانی اپنے راستے نہیں بدلتے
سدا روشن' یہ زندگی
کبھی نہ اس کی روشنی گھٹے
ہوائے مشعل پھولوں کی
کبھی نہ بجھتے دیکھی
گائیوں سے نہ چارہ گھٹے
پھانسیوں سے پنچھی
ہم نے کبھی نہ دیکھے
شاخیں کاٹنے سے درخت سوکھتے
قتل وغارت گری سے قومیں
اپنے حقوق سے دستبردار ہوتیں"

اور اپنی نظم "کانگو" میں کہتے ہیں:

اساں نہ ویکھی رتھ فجر دی کدھرے رہی کھلو

آخر ہوندی لو

انج دِلا نہ چتھیاں پو......"

یہ نظمیں شریف کنجاہی صاحب کے فکری نظام کی بہترین عکاسی ہیں۔ یہ فکر چاہے ان کے یہاں ترقی پسند لٹریچر پڑھنے سے آئی یا پھر رسل اور کروپاٹکن جیسے روشن خیال لوگوں کی کتابوں کے تراجم کرنے اور ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے آئی ہو۔ اپنی اس تبدیلی کو انہوں نے مثبت بغاوت کا نام دیا ہے اور اس تبدیلی کے پیچھے کارفرما عوامل کا انہوں نے ایک انٹرویو میں نہایت جامع اور تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ کہتے ہیں:

"یہ سفر بھی میرے اندر کی بغاوت کے نکتے سے شروع ہوا۔ بغاوت ایک بے راہ کا سفر ہوتا ہے۔ جس کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ میرا راستہ کس نے بنایا۔ میرے خیال میں یہ رسل نے بنایا۔ اور چند ایک روسی لکھاری بھی تھے، جن کے ناول میں نے پڑھے، اسطرح سے ایک اور راستہ آ گیا۔ وہ راستہ مجھے انگریزی لٹریچر اور روسی لٹریچر نے مہیا کیا۔ جب رسل کو پڑھا تو دیکھا کہ وہ خاص قسم کا سوشلسٹ تھا۔ وہ ایسا سوشلسٹ تھا جو جنگ میں یقین نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ امن پسندی میں اعتقاد رکھتا تھا۔ کروپاٹکن بھی امن پسند تھا۔ جنگ کو پسند نہ کرتا تھا۔ احراری تحریک، پنجاب میں مسلمانوں کی واحد تحریک تھی جو انٹی برٹش تھی۔ اور جیسے دشمن کا دشمن دوست ہو جاتا ہے، یہ بھی ایسا ہی وقعہ ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ صاحب کو اسلامیہ سکول پنجاب کے مالک مولوی عبداللہ صاحب نے بلوایا۔ ان دنوں احرار پارٹی کی وہی حیثیت تھی جو بعد میں پیپلز پارٹی کی بنی۔ وہاں میرا بھی شاہ صاحب سے تعارف ہوا۔ میں نے اس جلسے میں ان کے استقبال میں کوئی نظم پڑھی تھی، ان کے ذریعے میں حفیظ جالندھری صاحب سے متعارف ہوا۔ شاہ صاحب نے مجھے رقعہ دیا اور کہا کہ تم حفیظ صاحب سے شعروں کی اصلاح لے لیا کرو۔ میں رقعہ لے کر اپنے ہم نام دوست محمد شریف (والد

میجر شبیر شریف نشانِ حیدر) کے ہمراہ بائیسکلوں پر لاہور گئے۔ ہم رات کی چاندنی میں کنجاہ سے چلے اور اگلے روز لاہور پہنچے۔ جب میں حفیظ صاحب کی کوٹھی (ماڈل ٹاؤن) پہنچا تو وہ موٹر کار میں بیٹھ کر باہر جا رہے تھے۔ میں نے انہیں سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب کا رقعہ دیا' جس کی انہوں نے بڑی قدر کی۔ اور مجھے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ میں کئی روز تک ان کے پاس ٹھہرا رہا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد واپس گجرات آ گیا۔ یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔۔۔ حفیظ صاحب کا میرے دل میں بڑا احترام ہے' انہوں نے زندگی کے ہر کٹھن مرحلے میں میری مدد کی۔ میرے پاس آج بھی حفیظ جالندھری صاحب کے تیس چالیس خطوط ہیں جو انہوں نے ذاتی حیثیت میں مجھے لکھے' جن میں ایک بزرگانہ خلوص اور شفقت پائی جاتی ہے۔''

اور وہ نقطۂ نظر جس کے بہت بڑے پرچارک نظر آتے ہیں آج شریف کنجاہی صاحب' کو بھی شاید انہیں اپنے بزرگوں کے توسط سے حاصل ہوا ہے۔۔۔ پھر اردو میں اسلوب' لفظیات اور موضوعاتی اعتبار سے خوبصورت لہجے کے شاعر ہوتے ہوئے اپنی پنجابی شاعری کی طرف مراجعت کا بھی وہ عجیب قصہ بیان کرتے ہیں:

''میں کسی سکیم کے تحت پنجابی کی طرف نہیں آیا۔ میں تب بھی پنجابی میں لکھتا تھا۔ کنجاہ میں پنجابی کا رجحان زیادہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پنجابی کا اشاعتی شعبہ کمزور تھا۔۔۔ میں اپنی سوچ کا پنجابی میں اظہار کر کے خوشی محسوس کرتا تھا۔ کچھ یہ بھی وجہ تھی کہ پنجابی میں بہتر اظہار ہوتا تھا۔''

اور یہ بات ایک ایسا شاعر کہہ رہا ہے' جس نے اردو میں اس طرح کے اشعار کہہ رکھے ہیں اور اس طرح کی نظمیں:

''شکست کھا بھی چکا اعتراف کر بھی چکا
وہ آرزوؤں تمناؤں کے حسین سپنے
کہ جاگ جاگ کے راتوں کو جو بنے تھے کبھی
انہیں ادھیڑ چکا تار تار کر بھی چکا

اگر حیات عبارت ہے دل کے جینے سے
اگر حیات فقط سانس ہی کا نام نہیں
تو اس بدن کے قفس میں مری تلاش نہ کر"

اور یہ کہ:

"طویل رات بھی آخر کو ختم ہوتی ہے
سیاہی شب غم سے نہ مات کھائی گے
شریف نیم شبی اشک خستہ جانوں کے
طلوع صبح کا پیغام دیتے جائیں گے

وہ جب پنجابی کی طرف آئے تو پنجابی شاعری کا سورج قدیم کلاسک کی دیواروں سے ڈھل کر نوکلاسیکیت کی کھلی کھڑکیوں سے اپنی کرنوں کی پھوار لفظوں کے فرش پر ڈال رہا تھا۔ اور پھر اس فرش سے پڑھنے والوں نے دیکھا کہ موہن سنگھ ماہر' احمد راہی' امرتا پریتم اور شریف کنجاہی جیسی نرم کونپلوں نے سر نکالے اور آج یہ گھنے اور سایہ دار شجر ہیں۔۔۔ جدید پنجابی شاعری میں زبان' فکر اور اسلوب کی سطح پر ہونے والے تجربات کو بھی شریف کنجاہی صاحب اچھا شگون قرار دیتے ہیں۔ پنجابی زبان کے لیے' نظم کے لیے اور خود جدید شعراء کے لیے ان کے خیال میں جدید پنجابی شاعری میں وہ سب کچھ ہے جو کسی بھی زبان کی اچھی شاعری میں ہونا چاہئے۔ اس لیے میں اس کی رفتار سے مطمئن ہوں۔ انہوں نے کہا اور یہ بھی کہ اگر کہیں کسی کوست روی نظر آتی ہے تو اس میں شاعری یا شاعروں کا نہیں' حالات کی سرد مہری کا قصور ہے۔ اصناف کے تجربے کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ اظہار کی راہیں مخصوص نہیں ہوتیں۔ اظہار میں جدت بھی انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ وہ جدت بسا اوقات غیر مانوس بھی ہوتی ہے۔ جب ہم نے لکھنا شروع کیا تب آزاد نظم غیر مانوس تھی۔ اور اس کی مخالفت کی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ آزاد نظم پھیل گئی اور اس کا رواج عام ہو گیا۔ ممکن ہے نثری نظم آئندہ اپنے نامانوس ہونے کے دور سے گزر جائے اور مزاجوں کو تبدیل کرنے والی بن جائے۔ ہو سکتا ہے یہ تجربہ کامیاب نہ رہے لیکن اس کا فیصلہ مستقبل ہی کرے گا۔ کیونکہ کسی صنف کا جب کوئی اچھا شاعر مل جاتا ہے وہ اسے مقبولِ عام کی سند دلا جاتا ہے۔

عورت' عورت کی زندگی اور اپنی سماج کی عورت اور اس کی زندگی بھی کنجاہی صاحب کا خاص موضوع رہا ہے اور کہیں براہ راست عورت کی زبان میں تو کبھی اسے فصلوں' موسموں اور رتوں کی

علامتوں میں بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو سماج میں عورت کی حیثیت ہے۔ عورت جو قدیم عہد میں فصلوں، گیتوں، رسموں، ریتوں اور آرزوؤں کی پرورش کرتی رہی ہے۔ پھر اس نے یہاں کے صوفی شعراء کے یہاں محبوبیت کے استعارے کی اہم حیثیت حاصل کر لی ہے۔۔۔۔ اور جدید تر عہد میں مرد کے سماج میں اس کی ردّ و قدح کے باوجود اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھی۔ عورت جو شریف کنجاہی کے نزدیک ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے مقدس رشتوں میں مکمل اور کامل شخصیت کے ساتھ رہی ہے اور جس نے ہر امتحان کی گھڑی میں کامیابی اور سرخروئی کو اپنا مقدر بنایا ہے۔ شریف کنجاہی صاحب کے یہاں عورت سے مرد کے رشتے کی تقدیس پورے سراپے کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ وہ اسے مقدس رشتوں کے پورے سراپے کے ساتھ دیکھنے کے آرزومند نظر آتے ہیں اور شاعری میں سچائی بیان کرنے کے اس کردار پر خود بھی کاربند نظر آتے ہیں جو برسوں پہلے انہوں نے خود اخذ کیا تھا اور معاشرے کے تاریک پہلوؤں کو تاریک اور روشن پہلوؤں کو روشن کہتے ہیں۔ ان کی غزل کے کچھ اشعار دیکھئے:

سبھی ہوئی دس نہ سکدی جو سر ہیوں تے بیتی
اکھیاں والے توں کیہ اوہلے جو کجھ پوہ نے کیتی

ہر درزی نے اس چولے تے قینچی نوں ازمایا
کسے نہ کرماں والے سوئی نپ کے ٹاکی سیتی

دکھ سدھراں توں پیدا ہوندے پر دھراں توں خالی
جیہڑی جس کسے دی بیتی اوہوا اوگت بیتی

ان اشعار میں وہ تمام ترفنی خوبیاں موجود ہیں جن کا پنجاب کی دیہاتی زندگی سے اور پنجابی شاعری کی روایت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس لئے ان کے ہر لفظ، ہر سطر اور ہر شعر میں پنجاب کے پانچ پانیوں کی لہریں لہریئے لیتی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔۔ اور زندگی کے بارے میں ان کا فلسفہ جو آزادی کا، جدوجہد کا، ہمت اور اُدّم کا فلسفہ ہے اور یہ فلسفہ اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک انسان، انسان شناسی کی منزل تک اپنی رسائی ممکن نہیں بنا لیتا اور ڈرائڈن کے لفظوں میں:

The function of Literature is to provide a just and lively image of human nature"

اور انسان شناسی کی یہ صورت ہمیں شریف کنجاہی صاحب کی ہی ایک نظم سے مل جاتی ہے۔ جو

انسانی عزم کی خوبصورت ترین اور عمدہ ترین مثال ہے۔

''کیہ ہویا جے ہاتھاں چڑھیاں
کیہ ہویا جے ہاتھاں چڑھ کے لادتیاں سن جھڑیاں
اپنے پچھے لا کے جھڑیاں، لے آئیاں کانگاں دیاں چھڑیاں
چھتاں چوئیاں۔۔۔۔ ڈگیاں کندھاں کڑیاں
لیڑے بھجے دانے بھجے
جھلیاں نال سیانے بھجے
دریاواں نے بنھ نہ منے
وسدے نگر بنائے مڑھیاں
پانی نے منوائیاں اڑیاں، روڑھے مال اساڈے
دھرو دے کول شریکے ہے نیں اوہدے نال اساڈے
پر اس دے ای لیکھیں ہاراں، بنسی اوہ مہاراں
اس مستے ہاتھی نے پھسنا اوڑک جال اساڈے

شریف کنجاہی صاحب کی شاعری میں سارا حسن سچائی کا ہے اور سچائی شاعری کا خمیر، اس کی سروائول، اس کی بقا ہے۔ یہ ایک گہرا نفسیاتی بھید بھی ہے جس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی جاتی کہ شاعر ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے، اسے سچ بولنا چاہئے۔ اس لئے بھی کہ شاعری ردِ عمل ہے اور ردِ عمل ہمیشہ سچ ہی ہوتا ہے۔ بعدازاں اس پر عقلی اور جذباتی ملمع سازی کی دبیز تہیں بٹھا دی جائیں تو اور بات ہے۔۔۔ شاعری میں جب مصلحت شامل ہو جاتی ہے تو وہ جھوٹ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جھوٹ کا دوسرا نام تشبیہ ہے۔ سچائی حقیقت میں زندگی کے فطری عناصر سے اپنا رس کشید کرتی ہے۔ اس لئے شاعری فطرت کی ہی ایک صورت ہے جو لفظوں کا روپ دھار لیتی ہے۔ شریف کنجاہی صاحب کو شاعری انسانی فطرت کی اسی سچائی کی آئینہ دار ہے۔

شاعری ایک تخلیقی عمل ہے اور کنجاہی صاحب نے پروفیسر خالد ہمایوں سے ایک طویل انٹرویو میں جو بعد میں 'ویرتوں کنجاہ دا ایں' کے نام سے کتابی صورت میں بھی چھپ کر سامنے آ چکا ہے۔ فرسٹریشن اور فرکشن کو بھی تخلیقی عمل کا اہم جزو قرار دیا ہے۔ تخلیقی عمل کے لئے ناگزیر عناصر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''وہ تو یوں ہی ہوا کہ میں سوچوں اور کہوں کہ یوں

ہونا چاہئے اس طرح کیوں ہے؟ اور جب میں یہ سمجھ لوں کہ "یوں ہے" اور میری "کیوں" سے یہ تبدیل نہیں ہو سکتا تو پھر میں تخلیق کیا کروں۔ میں نے کسی نظام پر' کسی فرد پر یا پھر کسی صورتِ حال پر کیا کڑھنا ہے اور جب مجھے تکلیف ہی نہیں ہوگی تو پھر میں شعر ہی کیا کہوں گا' یہ ناگزیر ہے۔ مطمئن ہونے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ من میں کوئی طلب ہونا چاہئے۔ جسے ہم نے پہلے عشق کہا ہے اور اگر یہ بھی نہ رہے تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور یہی عشق ہے جس نے اس مردِ آزاد کو نوے برس تک تخلیق کی راہوں پر زندگی کی پر پیچ گتھیاں سلجھانے کے مشکل امر پر قدم بہ قدم آگے اور آگے بڑھایا ہے۔ روشنی کی طرف۔۔۔۔۔ زندگی کی طرف۔۔۔۔۔ مقصد کی طرف' روشنی اور زندگی کے مقصد کی طرف۔۔۔۔۔ اور دکھا گیا ہے کہ دنیا میں جب سے ادب کی تخلیق جاری ہے لکھنے والوں نے ایک ایسے زمانے کی نوید دی ہے کہ جب ہر طرف امن قائم ہوگا' سکھ ہوگا' شانتی ہوگی' ظلم و زیادتی اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائیں گے۔ اسے ایک طرح سے رجائی نقطہ قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔ شریف کنجاہی صاحب نے بھی اپنی شاعری' اپنی نثر میں اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

دراصل شریف کنجاہی صاحب کا تصنیف و تالیف کا سلسلہ اور تخلیق کا سلسلہ دریافت کا اور اسرار کے اظہار کا سلسلہ ہے۔ طلب و جستجو کا یہ سلسلہ انہیں شاعری' تراجم' تنقید و تحقیق کی وادیوں میں لیے پھرا ہے۔ اور وہاں سے انہوں نے علم و حکمت کے موتی چنے' انہیں ورق ورق بکھرا دیا۔۔۔۔ موجودہ عہد جو عالمی تہذیبوں کا امتزاج لیے انسان کے سامنے ابھر رہا ہے' پرانی قدریں کھو رہا ہے۔ اور اپنی اساس صریحاً انتشار' اضطراب' نفسانفسی' بیگانگیت اور روحانی عدم اطمینان پر رکھ کر آگے بڑھ رہا ہے۔ علم و ادب اور شعر و حکمت سے جڑے لوگوں کے ذہنوں میں بے شمار سوالات بھی اٹھا رہا ہے۔ سو معاصر' سماجی' سیاسی صورتِ حال جس انسان کی تشکیل کر رہی ہے اس کے آثار کئی دہائیاں قبل شریف کنجاہی اپنی چشمِ بصیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک پوری صدی کا تہذیبی و ثقافتی اثاثہ تھا اور اس میں وہ پرانی قدروں' ان قدروں سے جڑی اخلاقیات کے مثبت اور زندگی آموز مظاہر دیکھ چکے تھے۔ جب انہیں اس غیر مرئی اور کھوکھلی تہذیب سے اور اس تہذیب کے حامل انسان سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ دنیا کو کیا ہو رہا ہے۔ اور کہتے ہیں:

"بالیاں دا درد اے نہ وڈیاں دی شرم اے
بڈھیاں تے مہر اے نہ نڈھیاں تے کرم اے

تیویاں دا ستر اے نہ مانواں دا اے بھرم اے

دکھرا ای گنڈھ لیا بنداں نے دھرم اے

اکو جیہی سبھناں نے گول پی لئی اے

سوچنا واں دنیا نوں کیہ وگ گئی اے

ہمیشہ عظیم اور اعلی اقدار کا حامل وہ ادب وہ شعر اور وہ بات ہوتی ہے جو اپنی دھرتی' اپنی دھرتی کی مٹی' اس مٹی میں مہکتی فصلوں اور اس میں سانس لیتے لوگوں کی آرزوؤں' جستجوؤں' آسوں' پیاسوں' امیدوں اور محرومیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ شیر کنجاہی صاحب کے یہاں اپنے لوگوں کی آرزوؤں اور جستجوؤں کی ترجمان شاعری کا یہ رنگ ان کے پہلے شعری مجموعہ ''جگراتے'' تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ''ستارہ سحری'' ''سورج' سوچ اور سائے'' ''لمحوں کا صحرا'' اور ''اوڑک ہوندی لو'' میں ان کا یہ رنگ اور زیادہ گہرا ہوا ہے اور زیادہ نکھرا ہے۔۔۔۔ دیکھا جائے تو پہلے شعری مجموعہ کے شائع ہونے (۱۹۵۸ء) اور آخری شعری مجموعہ شائع ہونے (۱۹۹۵ء) کے درمیان سینتیس (۳۷) برس کا فاصلہ ہے۔ اس عرصہ میں دنیا میں کتنی تبدیلیاں آئیں' کتنے لوگ تھے جو ان کے شریک سفر تھے' نہ رہے اور کیسے کیسے خواب تھے جو زندگی کے چوراہے میں ٹوٹ گئے۔ اپنے پیاروں کی سبھی یادوں اور ماضی کے سبھی خوابوں آنکھوں میں بسائے شریف کنجاہی صاحب آگے ہی آگے بڑھتے رہے ہیں۔ اگر زندگی کے کسی ایک راستے کا موڑ کہیں راستے کا اختتام بن کر سامنے آیا تو انہوں نے وہاں سے ایک نئی راہ نکالی اور اپنے اور اپنے پیچھے آنے والے قافلے کو رکنے دیا ہے اور نہ بھٹکنے دیا ہے۔۔۔۔۔!!

تاہم اس سب کے باوجود انہیں اپنے لوگوں' اپنے لوگوں کے کلچر' ان کی ثقافت' ان کے گیتوں' سہروں اور شہروں میں بس رہی گلیوں' بازاروں سے محبت اسی طرح قائم رہی ہے۔ وہ ان لوگوں کو نئی دنیا' نئے لوگوں' نئے نظریوں اور نئی صبحوں کا پتہ دیتے رہے تو محض اس لئے کہ ان کی انکھوں میں موجود خواب روشن رہیں کہ خواب شیشوں جیسے ہوتے ہیں' ٹوٹ کر چکنا چور نہ ہو جائیں اور ان کی کرچیاں انہیں چبھتی نہ رہیں۔ اپنی ثقافت اور اپنے کلچر سے محبت کی جو بات ہے' اس کی ایک جھلک ہمیں جون (۱۹۶۰ء) میں سجاد حیدر کے ڈراموں کے مجموعہ ''ہواوے ہوکے'' پر چھپنے والے مضمون میں بھی ملتی ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

''گاؤں والوں کے ساتھ میل ملاپ نے انہیں دو چیزیں دی ہیں اور وہ

دونوں ہی ان کے ڈراموں کی جان ہیں۔ایک زبان اور دوسرا امیر غریب سے آشنائی۔۔۔۔شہروں کا رہن سہن گاؤں کے مقابل بہت مختلف ہے' اس لیے دونوں جگہوں کے رہنے والے اپنی تکلیفوں کا علاج ایک سرے سے نہیں کرتے۔۔۔۔۔گاؤں' ایک تو شہر کی نسبت کم آبادی والے ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ قانون والوں سے بہت دور بیٹھے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔!''

یہاں شریف کنجاہی صاحب کا مطلب ان کی قانون سے دُوری نہیں بلکہ ''اندھے قانون'' کے ''سماج'' سے دوری ہے۔ ورنہ ان کی اپنی پنچائیت ہوتی ہے' چوپال ہوتا ہے اور ایک (اائی) منصف ہوتا ہے۔خیر! اب تو یہ بھی ماضی ہی کی بات لگتی ہے لیکن چونکہ کنجاہی صاحب نے سجاد حیدر صاحب کے ڈراموں کے تناظر میں یہ بات کی ہے اور جب یہ ڈرامے لکھے گئے تھے تو پنجاب کا تہذیبی اور تمدنی نظام بالکل ویسا ہی تھا جس کی شکل سجاد حیدر نے ہمیں اپنے ڈراموں اور کنجاہی صاحب نے اپنے مضمون میں دکھائی ہے۔۔۔۔دیہات' تہذیبی عناصر کا منبع ہوتا ہے اور زبان' محاورے اور گرائمر کی بنت' اسکی ساخت جو یہاں آباد لوگ ترتیب دیتے ہیں بعد میں وہی ادبی معیارات ٹھہرتے ہیں۔شاید یہی سبب ہے کہ دنیا میں زیادہ تر جو بڑا ادب لکھا گیا ہے' اس کا خمیر دیہاتی زندگی سے اٹھا ہے۔شریف کنجاہی صاحب کی شاعری اس بات کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہے' خاص طور پر وہ نظمیں جن میں گیتوں کا سا آہنگ ملتا ہے' جن میں عورتوں کی زبان ملتی ہے اور جن میں فوک وزڈم نظر آتی ہے:

''منڈا میرے ہان دا
مونہہ چٹ لگدا تے نالے خاندان دا
گلاں کرے سوہنیاں
کہیاں من موہنیاں
ہس ہس بولدا
نکے نکے بلھاں وچوں رس پیا ڈولھدا
مائے نی کیہ دساں ڈاہڈا مٹھڑا زبان دا
زویں بھاندے والا مائے

آپے واہے' آپے کھائے
او تھے نہ اڑیکا کوئی سس تے نناں دا''

اور آخر میں ایک اور نظم دیکھتے ہیں جو کنجاہی صاحب کے شعری میلانات کی آئینہ دار ہے۔ نظم ہے ''مسافر''

''تیرا پنڈا پوری توت دی تیری لگراں ورگی بانہہ
تیرے مُکھ نے پھل کریر دے تیرا جوبن ون دی چھاں
ایہہ چھاواں سدا نہ رہندیاں رہ جائے پچھے ناں
اسیں رب سببی گوریئے اج آ گئے ایس گراں
اساں جھٹ دوپہر گزارنی اساں بہنا نئیں پڑاں
اساں پنڈ نہ پانے جوگیاں' اساں مل نہ لینے تھاں
کس لکھے پا کے بیٹھنا ایہہ دنیا اک سراں
تیرے جوبن وانگوں گوریئے اسیں کل مسافر ہاں۔۔۔!

تنقیدی سفر کا پہلا پڑائو "جھاتیاں"

۱۹۴۴ء میں سجاد حیدر کی فرمائش پر میں نے میاں محمد بخش پر ریڈیو کے لیے تقریر لکھی۔ ۱۵ مضامین پر مشتمل ان کا تنقیدی مجموعہ 'جھاتیاں'' ۱۹۶۰ء میں پہلی بار چھپا۔ یہ کلاسیکی اور جدید ادب پر اولین تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں سے ایک تھا۔ پہلے ایڈیشن کے شروع میں ''کر لیئے دو باتاں'' کے زیر عنوان کنجاہی صاحب لکھتے ہیں: (ترجمہ)

''جس طرح نام سے ظاہر ہے یہ تخلیق کوئی گہری تحقیق نہیں، محض ''جھاتیاں'' ہیں جھات مار کر کسی کا انگ انگ جتنا کچھ دیکھا جا سکتا ہے، اس سے زیادہ کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔ دوسرے مضمون میں سنسکرت اور پراکرت کے بارے میں ایک علیحدہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ مضمون امروز میں شائع ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ مجھ سے زیادہ جاننے والے اس پر زیادہ روشنی ڈالیں گے لیکن افسوس کہ کسی نے بھی نہیں بتایا کہ میرا خیال درست ہے۔ کہ میں نے غلطی کھائی ہے۔ اب اس کتاب کے شائع ہونے سے مجھے ایک بار پھر عرض کرنا ہے، جن کا مطالعہ سنسکرت کا زیادہ ہے وہ اس طرف توجہ دیں۔۔۔ اتفاق سے میری ملاقات کچھ دن ہوئے پشاور میں ڈاکٹر جی سی دیو (ڈھاکہ یونیورسٹی) سے ہوگئی۔ جب ان سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ بات من کو لگتی ہے، لیکن اس بارے زیادہ تحقیق ضرورت ہے۔''

ایک بات جو "جھاتیاں" کے اس ایڈیشن میں موجود اس ابتدائیے سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شریف کنجاہی صاحب نے لسانیات پر توجہ اور غور وفکر کا سلسلہ آغاز ہی سے کر رکھا تھا لیکن بعد میں انہوں نے اس پر اور زیادہ محنت اور لگن سے کام کیا اور زبان کے جغرافیائی اور تہذیبی روابط کو "رگ وید" اور "سکینڈے نیویین لسانی تعلقات" کے سلسلے میں اپنے کام میں سامنے لانے کی سعی کی۔

"جھاتیاں" میں شامل بھی مضامین بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ تاہم کچھ پنجابی شاعری دے بارے "لوریاں' لوک گیت' صوفیاں دی شاعری مقبل دی ہیر' وارث شاہ تے اوس دی ہیر' ہیر اک ضدی کڑی" "وارث شاہ دا پنجاب" "سیف الملوک ول اک جھات' ترنجن ول اک جھات" وغیرہ۔ کنجاہی صاحب کی تنقیدی بصیرت ملاحظہ فرمائیے کہ وہ کس حسن وخوبی کے ساتھ اپنی بات پڑھنے والے تک پہنچاتے ہیں۔ لوک گیت میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"وہ ماضی جس نے پلٹ کر نہیں آنا اور وہ بڑے جن کو ہم نے کبھی نہیں دیکھنا' وہ زمانے کیسے تھے' اور وہ لوگ کس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان سب کی خبر ہمیں تعصب اور ضد سے اوپر ہو کر لوک گیتوں کے ذریعے ملتی ہے۔"

"صوفیاں دی شاعری" کا آغاز کرتے ہیں: (ترجمہ)

"نانک دکھیا سب سنسار"

اس بول میں پنجاب کے اس بہت بڑے گرو' صوفی اور شاعر نے صوفی شاعری کا نچوڑ نکال کر رکھ دیا ہے۔ یہ شاعری زیادہ تر اس بات کا اظہار ہے کہ یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ ادھر اتفاق سے رہنے سہنے کے غلط سلسلوں اور رواجوں کے کارن لوگوں کی تقدیر آج تک دکھ ہی سے تعبیر رہی ہے۔ یہ دکھ ہر زمانے میں اپنی سچائی کو زندہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح وہ اپنے ہم عصر اور پنجابی نظم کے اعلیٰ شاعر احمد راہی کے شعری مجموعہ "ترنجن" کے بارے میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

"راہی کی نظموں میں ترنجن کی سچی اور خالص روح کی جلوہ گری ہو رہی ہے۔ وہ خود بھی ان لوگوں میں سے ہے جو چرخہ بھی کاتتے ہیں اور ہونٹوں کو بھی نہیں سیتے۔"

ان تین مثالوں سے ایک بات تو طے ہے کہ شریف کنجاہی محض ایک اوپری نظر سے شاعری کا مطالعہ کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ایک ایسے نقطۂ نظر کے حامی ہیں جو تخلیقات سے نتائج اخذ کر سکے۔ شریف کنجاہی صاحب کے مجموعی کام کو دیکھیں یا ان کا مطالعہ انفرادی سطح پر کریں، یہ معلوم ہوتا ہے انہوں نے اپنے آپ کو کسی ایک مضمون یا کسی ایک موضوع تک محدود نہیں رکھا۔ خالص ادبی کام کے علاوہ انہوں نے علمی اور مذہبی علوم کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے تراجم کیے ہیں اور کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہمیں ''جھاتیاں'' میں بھی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم رانا کے نزدیک:

''شریف کنجاہی کے تنقیدی مضامین کی کتاب ''جھاتیاں'' اس لیے ہی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ پاکستان میں چھپنے والی پہلی تنقیدی کتاب ہے بلکہ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں بعض ایسے مضامین بھی ہیں جو پاکستان بننے سے پہلے لکھے گئے اور پنجابی کے شعروں اور نثر کا پہلی بار سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کیا گیا۔ اور نئے تنقیدی دبستانوں اور تحریکوں کے حوالے سے پنجابی میں تنقید اور تحقیق کی بنیاد رکھی گئی۔''

اس تنقیدی مجموعہ میں کنجاہی صاحب کے وہ دو مضامین بھی ہیں جو مقبل اور وارث شاہ کی ہیر کے حوالے سے ہیں۔ انہوں نے بظاہر ان مضامین کا تنقیدی تجزیہ تو نہیں پیش کیا لیکن ایک سطح پر ان کے درمیان تجزیاتی مطالعہ ملتا ہے۔۔۔۔ ہیر لکھنے والے شاعروں میں دمودر داس، احمد گجر بھی مشہور شاعر ہیں۔ تاہم مقبل اور وارث شاہ کی ہیر کی اپنی اپنی سیاسی اور سماجی تناظر میں اہمیت بنتی ہے۔ جس کو انہوں نے نہایت تفصیل اور تجزیے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وہ اپنی تنقیدی مضامین میں عمرانی اور تاریخی پس منظر کو برتنے پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اور ان کے نفسیاتی تجزیہ کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: (ترجمہ)

''ہر نقاد اپنی افتادِ طبع کے مطابق شاعر کی ذات کے اندر نظر دوڑاتا ہے۔ میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ لفظوں کے پیچھے چھپی ہوئی شخصیت کو تلاش کیا جائے۔''

ان کے اس نفسیاتی نقطۂ نظر کے پیچھے ظاہر ہے ان کی نفسیات سے گہری دلچسپی ہے جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

''ہر شاعر کو نفسیات سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ اگر شاعر وارداتی ہے تو نفسیاتی یقیناً ہوگا۔ انسانی نفسیات کو جانے بغیر محاکات کو جانا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے''

اور آخر میں علامتوں اور ثقافتوں کے حوالے سے ایک ایک فقرہ دیکھتے ہیں۔

''علامتیں لاشعور کا حصہ ہوتی ہیں اس لئے ادب میں گہرائی پیدا کرتی ہیں، میں خود اس علامت نگاری کا ماہر نہیں لیکن علامت نگاری کے رجحان کو پسند کرتا ہوں۔''

اور یہ کہ

''علاقائی ثقافتوں کی حیثیت قومی زندگی میں ایسے ہی ہے جیسے بدن میں مختلف اعضاء کی۔''

شریف کنجاہی صاحب نے جب اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ تاریخ میں اس وقت سماجی، تعلیمی، مذہبی اور تہذیبی حوالے سے تحریکیں چل رہی تھیں۔ ان سبھی تحریکوں کے اثرات اس وقت کے ادبی اور شعری میلانات پر واضح نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان اثرات سے ہمیں کنجاہی صاحب کی تخلیقات بھی مبرا نظر نہیں آتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی تخلیقات پر اس کے اثرات واضح ہیں بلکہ ان کے تراجم کے رجحان سے بھی ان کا اظہار ہو رہا ہے۔

ترجمے کا تجربہ اور ''آزادی کی راہیں''

برٹرینڈ رسل کی کتاب "Road to Freedem" ہی وہ پہلی تصنیف ہے جس کا ترجمہ ''آزادی کی راہیں'' کے نام سے ۱۹۳۹ء میں سامنے آیا۔ اور یہ پہلی نثری کتاب بھی تھی جو کنجاہی صاحب کے حوالے سے سامنے آئی۔ اگر چہ یہ ان کی ذاتی تصنیف نہ تھی تاہم یہ کتاب نہ صرف اپنے نام کے حوالے سے بلکہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اور خود اس کے مصنف (رسل) کے حوالے سے بھی بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ چونکہ کنجاہی صاحب کے مزاج میں شامل تھا انسانی آزادی کا رویہ' انسانی آزادی کی توقیر اور انسانی عظمت کے قائل ہیں کنجاہی صاحب' سو انہوں نے اس کا ترجمہ کیا اور پھر۔

یہ رسل ہی تھے جن کے ذریعے وہ ایک ترقی پسند اور انسانی آزادی اور انسانی آزادی سے جڑی قدروں کے ترجمان روسی مصنف کروپاٹکن'' سے متعارف ہوئے۔ اس سلسلے میں کنجاہی صاحب نے بڑی دلچسپ بات کی۔

> ''چنانچہ جہاں میں نے ''روڈ ٹو فریڈم'' کا ترجمہ کیا ''آزادی کی راہیں'' جو ''نیا ادارہ'' والوں نے چھاپی وہاں اس کے ذریعے مجھے کروپاٹکن میں دلچسپی پیدا ہوئی تو میں نے اس کی وہ کتاب پڑھی۔ اور اس کا ترجمہ بھی کیا۔ میوچل ایڈ' لیکن یہ ترجمہ چھپ نہ سکا۔

یہ پرنس کروپاٹکن بھی عجیب و غریب شخصیت کے انسان تھے۔ کہنے کو وہ

ایک انارکسٹ کمیونسٹ تھے'ان کا براہ راست کمیونزم سے کوئی تعلق بھی نہ تھا لیکن کنجاہی صاحب نے ان کا کوئی مضمون پڑھا جو انہیں اقبال کی سوچ سے قریب تر نظر آیا۔اس کی ایک کتاب Conquest of Bread روٹی کی فتح'' شریف کنجاہی صاحب کے اپنے کہنے کے مطابق ''آزاد سماج'' میرا ڈائریکٹ ترجمہ نہ تھا اگرچہ پبلشر نے اسے میرے ڈائریکٹ ترجمے کے حوالے سے شائع کر دیا۔۔۔۔۔وہ انگریز کا دور تھا۔اس لیے اس کتاب کے پورا شائع ہونے میں مسئلہ تھا۔اور بقول کنجاہی صاحب کے اس کے چند ابواب ہی قبول کیے جا سکتے تھے۔میں نے ہندی ترجمے کو اردو رسم الخط میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ڈھالا۔اور یہ چھپ گئی۔''

اگرچہ کنجاہی صاحب نے مختلف اوقات میں مختلف طرح کے تراجم کیے۔''شریف کنجاہی ''انکار سے اقرار تک'' میں ان کے ٹیگور کے ترجمے کے ذکر بھی ملتا ہے۔لیکن اپنی گفتگوؤں اور تحریروں میں وہ بار بار کروپاٹکن کا ذکر کرتے ہیں۔

اور جہاں تک ترجمے کے فن اور اس سے محبت کا تعلق ہے تو وہ اس سلسلے میں کیا خوبصورت بات کہتے ہیں:

''تنقید'تحقیق اور ترجمے کو بھی میں کسی حد تک تخلیقی کام سمجھتا ہوں۔وہ اس لیے کہ تنقید اصل میں یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ کسی بات میں کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔اور اسی طرح کسی شاعر کے کلام کو پڑھتا ہوں تو میری تنقید اس کے اندر چھپی ہوئی بعض باتوں کو معلوم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔اور یہ کوشش میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرح کا تخلیقی عمل ہے۔اور ترجمے میں آپ کی ترجیح ہو تو ظاہر ہے کہ اس میں وہی مسرت پیدا ہوتی ہے جو تخلیق میں ہوتی ہے۔''

اور ایک بڑے تخلیق کار کی یہی تعریف ہے کہ ترجمے'تنقید اور تحقیق میں بھی وہ چاشنی'حسن اور انفرادیت پیدا کر دے کہ پڑھنے والا اس سے تخلیقی عمل کا ترفع اور مسرت حاصل کر سکے۔جہاں تک شریف کنجاہی صاحب کے کیے ہوئے تراجم کا تعلق ہے۔

رسل کی طرح انسانی آزادی کروپاٹکن کا بھی اہم موضوع ہے۔کروپاٹکن کی اس کتاب میں سے

کنجاہی صاحب نے دولت، خوشی، ملکیت کا خاتمہ اور انارکسٹ فلسفۂ حیات کے نام سے موجود ابواب کے تراجم کیے ہیں۔ جن میں کروپاٹکن نے یہ فلسفہ دیا ہے کہ "ہر فرد آزاد ہے، اسے صلح صفائی سے جینے کا حق ہونا چاہیے، کوئی حکومت اور کوئی تعزیری قانون نہیں ہونا چاہیے" آپ سوچئے کیا خوبصورت فلسفۂ حیات ہے؟

منظوم "جاوید نامہ پنجابی"

پچھلی صدی کی ۶۰ ویں دہائی میں شریف کنجاہی صاحب نے "جاوید نامہ" کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا لیکن ۲۱۶ صفحات پر مشتمل اس منظوم پنجابی ترجمے کو جنوری ۱۹۷۷ء میں پہلی بار "مجلس ترقی ادب" کلب روڈ، لاہور نے شائع کیا۔ یہ ترجمہ ایک شاندار پیش کش تھی شریف کنجاہی صاحب کی طرف سے پنجابی ادبی دنیا کے لیے۔

یہ کہنا چاہیے کہ "جاوید نامہ" فارسی میں اقبال کی ایک عظیم اور شاہکار تخلیق تصور نہیں کی جاتی۔ پنجابی میں اس کا ترجمہ پنجابی لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے بھی "نئے جہانوں کی سیر" کے مترادف تجربہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے شریف کنجاہی صاحب نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے: (ترجمہ)

> "یہ کتاب ایک سوچ اڈاری ہے، کوئی وقوع پذیر حقیقت نہیں۔ ایسی اڈاریاں مشرق و مغرب کے ادب میں عام ہیں، زیادہ تر مشرق میں ــــــ۔ واقعہ معراج کے علاوہ آتش پرستوں کے نیم مذہبی لٹریچر میں بھی اس کے نشانات ملتے ہیں۔ اور "ارداویراف نامہ" ایک ایسی ہی سیر کہانی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ویراف کی روح کو کس طرح اس کے مذہب کے روحانی پیشواؤں نے ورد وظیفے کر کے آسمانوں کی طرف بھیجا تاکہ وہ وہاں اچھائی برائی کرنے والوں کا احوال دیکھے اور یہاں آ کر دنیا چھوڑنے والوں کو بتائے۔ عربی میں ایک بڑے صوفی ابن عربی نے بھی اسی طرح کی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "فتوحاتِ مکیہ" ہے۔ وہ کتاب مکہ میں بیٹھ کر لکھی گئی تھی۔ بلکہ ایک اور کتاب بھی ان کی اسی

موضوع پر ہے جس کا نام ''کتاب الاسراء مقام الاسریٰ'' ہے۔ ابن عربی کی انہی کتابوں سے متاثر ہو کر یورپ کے مشہور شاعر ''دانتے'' نے ''ڈیوائن کامیڈی'' لکھی۔ ''ڈیوائن کامیڈی'' کے بعد میرے خیال میں جاوید نامہ کا نام ہی لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ عربی' فارسی' پنجابی اور بعض یورپی زبانوں میں یوں تو اس مزاج کی کچھ نہ کچھ چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ان ستاروں سے بڑھ کر نہیں ہوتی جو رات کو چمکتے تو ہیں لیکن اپنا نام کوئی نہیں رکھوا سکتے۔''

یوں ''ارداویراف نامہ' فتوحات مکیہ'' ''کتاب الاسریٰ مقام الاسریٰ'' اور ڈیوائن کامیڈی جیسے عالمی تخلیقی شاہکار کے ساتھ ''جاوید نامہ'' کا تقابل بذات خود بہت بڑا ٹربیوٹ ہے لیکن ''جاوید نامہ'' کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ اقبال پر کائنات کے بعض ایسے راز بھی منکشف تھے جن کا شخصی سطح پر اظہار نہ کر کے اقبال نے اپنی وجودی عظمت اور اس کا اعلیٰ پیمانے پر شعری اظہار کر کے عظیم تر تخلیقی عظمت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اب ان کے ترجمے کے حسن کو ملاحظہ کیجئے:

فرشتیاں دا گیت

نوریاں نالوں مٹھ مٹی دی لاٹ ودھے اک ویلے
اس دا بھاگ ستارہ دھرتی عرش کرے اک ویلے
اوہ خیال اس دا جو پلدا کھا ہونی دیاں ٹھلاں
نیلے پُڑدے گھمن گھیروں پار ہووے اک ویلے
آدم دا کیہ سمجھ اے مطلب' کیہ توں پچھنیں ساتھوں
اجے طبیعت دے وچ رڑکے پیار کرے اک ویلے
ویکھن وچ اس ایویں جے مضمون کدے انج رسنا
خون ہونا تاثیروں رب دے وی جگرے اک ویلے

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شریف کنجاہی صاحب نے اس ترجمے کے حوالے سے اپنے مختصر سے دیباچہ میں محض اور محض اس نظم ''جاوید نامہ'' کی تعریف و توصیف ہی بیان کی ہے اور اپنے ترجمے کے حوالے سے کسی قسم کے تذکرے سے احتیاط برتی ہے۔ حتیٰ کہ اس ترجمہ کے دوران

درپیش معاملات ومشکلات تک کا ذکر تک بھی نہیں کیا۔ یہ بات اپنی جگہ درست اور برملا ہے کہ وہ فارسی زبان وادب کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اور صرف یہیں تک نہیں محدود بلکہ ان کا فارسی زبان میں اپنا ایک شعری مجموعہ چھپ کر سامنے آ چکا ہے۔ اور ادبی تجزیہ نگاروں کے نزدیک ترجمہ تخلیق نو'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے ترجمہ نگار کا دونوں زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ بلکہ زبانوں کی اصطلاحات' گرائمر' سب پر مکمل گرفت لازمی ہے۔ اور پھر جب آپ شاعری کا ترجمہ کرتے ہیں اور وہ بھی منظوم تو بات اور زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہو جاتی ہے۔

''جاوید نامہ'' کے اس منظوم پنجابی ترجمہ کا مطالعہ نہ صرف ہمیں کنجاہی صاحب کے پنجابی اور فارسی زبانوں کے ماہر کی حیثیت سے ہمارا تعارف کرواتا ہے بلکہ وہ ان خفتہ علوم کی باریکیوں سے بھی آگاہ دکھائی دیتے ہیں جنہیں اقبال نے اپنی فلسفیانہ اساس بنایا ہے۔ اب ''شہر مرغدین دی سیر'' کے عنوان سے ترجمے کے کچھ بند دیکھیں' لگتا ہے کنجاہی صاحب نے اقبال کی شاعری میں غرق ہو کر ترجمہ کیا ہے:

''مرغدین تے اس دے اچے اچے محل چبارے
کیہ دساں اس کرماں والی وستی دے نظارے
اس دے وسنیکاں دی بولی شہد سواد بھلاوے
سوہنے مکھڑے خو بو چنگی تے سارے پہناوے
فکر اوہناں دی ''جوڑن چین'' والے خفتوں خالی
سورج دی کیمیائی دے ہے بھیت پچھانن والی
حاصل کردا سونا چاندی نوروں جو کوئی چاہندا
لونے پانی وچوں جیوں کر لون نکھیڑیا جاندا
خدمت وڈا مقصد جانن اوتھے علم ہنر دا
کماں نوں کوئی سونے والی نئیں ترکڑی دھردا''

علم الاقتصاد اور ''خطبات اقبال''

اگر یہ کہا جائے کہ ''علم الاقتصاد'' اردو زبان میں اقتصادیات پر پہلی باضابطہ کتاب ہے تو درست ہوگا۔ پہلی بار یہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اور وہ اقتصادی اصطلاحات جو اردو زبان میں

خشک اور مشکل تصور کی جاتی تھیں' اقبال نے اس خوبی اور آسانی کے ساتھ ان کو برتا کہ بعد ازاں انہیں رائج ہونے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کتاب کی دوسری اہمیت یہ بھی بنتی ہے کہ شبلی نعمانی نے اس پر نظرِ ثانی کی اور عالمِ اقتصادیات اسے اپنے دور ہی کی نہیں' موجودہ دور کی بھی اہم کتاب گردانتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

دیکھا جائے تو اسلامی تاریخ میں اقتصادی علوم کو لکھنے کا رواج بہت کم رہا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے انسانی تہذیب وتمدن کے مطالعہ کا سلسلہ معاشی معاملات سے جوڑا۔ بعد ازاں سرسید احمد خان نے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں اس معاملے کو بنیادی اہمیت دی۔

ممتاز حسن نے اقبال اکادمی کراچی سے تقریباً ۵۸ برس بعد ۱۹۶۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تھا۔

شریف کنجاہی صاحب نے اس کتاب کے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا پنجابی ترجمہ کیا۔ جسے ۱۹۷۷ء میں بزمِ اقبال' لاہور کے زیرِ اہتمام شائع کر دیا گیا۔

کنجاہی صاحب نے ترجمہ کرتے وقت اصطلاحات کو پنجابی لسانی رویوں کے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور اس عہد میں کہ جب پنجابی میں کتب شائع ہونے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ کر کے اسے شائع کروانا' نہایت احسن اقدام نظر آتا ہے۔

دوسری اہم بات ''خطباتِ اقبال'' کا رواں' سلیس اور خوبصورت نثری ترجمہ ہے جو ۱۹۷۷ء ہی میں اشاعت کے مراحل سے گزر کر سامنے آیا۔ ان خطبات کے پنجابی تراجم کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ علامہ محمد اقبالؒ نے پہلی بار مغربی دانشوروں کو انہی کے انداز میں اعلیٰ فلسفیانہ سطح پر مخاطب کیا۔ اور جس لہجے اور اسلوب میں بات کی وہ بھی ان کے لیے کوئی زیادہ انجان اور نا آشنائی کا نہ تھا۔ ان خطبوں کی فکری اور فلسفیانہ عظمت کا احساس اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کم وبیش ڈیڑھ سو مشرقی ومغربی علماء' دانشوروں اور مفکروں کے حوالے ملتے ہیں۔ لہٰذا ان خطبوں کے اسلوب' تراکیب' اصطلاحوں اور حوالوں کو ترجمہ کرنا کارِ مشکل تھا۔ ایک راستہ تو یہ رہ جاتا تھا کہ شریف کنجاہی صاحب ان عربی اور فارسی اصطلاحوں کو تھوڑی سی ترمیم و اضافہ کے ساتھ پنجابی میں ڈھال دیتے' جس کا کہ رواج اکثر مترجمین کے یہاں نظر آتا ہے۔ لیکن شریف کنجاہی صاحب کے تراجم بھی اسی طرح انفرادیت اور بھرپور لب و لہجہ کے ترجمان نظر آتے ہیں جو ان کی شاعری کے ترجمے کا خاصا رہے

ہیں۔

شریف کنجاہی صاحب کے تراجم کا مطالعہ کرتے وقت تو اسلوب میں روانی اور سادگی آپ کو کسی سطح پر بھی یہ احساس نہیں ہونے دیتی کہ آپ ایک مشکل فکری نقطۂ نظر کی حامل کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کے اس ترجمے کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے خالص علمی اصطلاحات کو پنجابی کے عام بول چال کے لفظوں کے ذریعے ہی اظہار بنالیا ہے۔ جوان کا ان علوم سے دلچسپی اور آگہی کا عکاس حوالہ ہے۔

یہ خطبات جو اس خطے کی تاریخ ہی میں نہیں، مسلمانوں کی زندگی میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں' ان کی اصل حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی درخواست پر یہ خطبات مدراس' حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیئے تھے۔ یہ چھ لیکچرز تھے اور زیرِ موضوع بحث تھی کہ موجودہ زمانے میں مغربی فلسفے کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے علم کی مختلف شاخوں میں جو نئے اضافے ہوئے ہیں انہیں مدِنظر رکھتے ہوئے اسلام کے مذہبی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر کو از سرِ نو تشکیل دیا جائے۔ بعد میں انہوں نے ایک لیکچر Aristotelian Society لندن کی دعوت پر پیش کیا تھا۔ یوں یہ کل سات لیکچرز کا مجموعہ بن گیا۔ یہ سبھی لیکچر انگریزی زبان میں تھے۔ بعد ازاں سید نذیر نیازی کے کہنے کے مطابق علامہ اقبال کی خواہش کے عین مطابق ان کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا۔

ان لیکچرز کے موضوعات بہت مشکل ہیں کیونکہ اسلامی فلسفہ (علم کلام) اور جدید ترین مغربی فلسفوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بعض ایسے مسئلوں کی وضاحت کی گئی ہے جو مذہب اور فلسفے میں مشترک ہیں۔ ان لیکچرز میں شعر' فلسفہ اور مذہب کے آپسی رشتوں کو پیشِ نظر رکھ کر بات کی گئی ہے۔

جہاں تک ترجمے کی روایت کا تعلق ہے تو جب سے تہذیبوں' معاشروں اور مختلف النوع تمدن رکھنے والے ممالک کے درمیان تعلقات کا سلسلہ آغاز ہوا تب سے ہی ترجمہ انسان کی بنیادی ضرورت بن کر رہ گیا ہے۔ تاہم یہ لازم نہیں کہ ہر زبان اور ہر زبان کے طریقِ استعمال کا 'تراکیب' اصطلاحات اور گرائمر کا اشتراک ہو۔ اس لیے ترجمہ کرتے وقت بہت سی باتوں کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ جب ہم ان خطبات کا مطالعہ کرتے ہیں تو بات سب سے اچھی اور قابلِ ذکر نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ شریف کنجاہی صاحب ان تراجم کو پنجابی کے روزمرہ کے اس قدر نزدیک لے آئے ہیں

کہ پڑھنے والے کو کسی وقت، کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

انگریزی زبان میں نثر کی صفت کو ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلوب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ آپ کتاب پڑھتے جائیں اور اس کی زبان اور بیان اس قدر سلجھا اور نپا تُلا ہو کہ کسی جگہ کسی فقرے یا جملے کی ترکیب اس کا استعمال پڑھنے والے کو الجھن میں نہ ڈالے۔ اور زبان میں ایسی روانی ہو کہ قاری کو اپنے ساتھ بہائے لیے چلی جائے۔ اور جیسا کہ شریف کنجاہی صاحب نے کتاب کے شروع میں اس امر کا اعتراف کیا ہے:

''فلسفے کا بہت کم علم رکھنے کے باوجود مجھے ان افکار میں لطف آتا ہے۔''

اس بات میں بھی ان کو ترجمے میں درپیش مسئلے کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ پنجابی زبان میں شاعری کا ورثہ تو بے شمار اور ان گنت ہے لیکن نثری ادب اس قدر نہیں لکھا گیا۔ خاص طور پر اس وقت کہ جب شریف کنجاہی صاحب نے یہ ترجمہ کیا تب تو پنجابی میں نثر لکھنے کا رواج بہت ہی کم تھا۔ اور پھر ایسے سنجیدہ موضوعات پر تو بہت ہی کم کام ہو رہا تھا۔۔۔!

شریف کنجاہی صاحب نے اپنے اس ترجمہ کے آخر میں اشخاص، مقامات اور کتب کے اشارات تو دیئے ہیں تاہم اصطلاحات کی جامع فہرست دینے سے گریز کیا ہے۔ اگر ہم کنجاہی صاحب کے کیے ہوئے ترجمے میں سے کچھ مثالیں دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے انگریزی کے بعض لفظوں اور اصطلاحات کو اس قدر جامعیت کے ساتھ پنجابی میں ترجمہ کیا ہے کہ اس سے دوسرا لفظ کوئی لفظ سوجھتا ہی نہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے Alien (ابوبھڑ) Senseperception حس کیز، Infinitive (بے انت) اور (دِسل) Visible لفظ استعمال کیے ہیں۔

خطبات اقبال کے پنجابی تراجم درحقیقت پنجابی کے نثری ادب میں بے بہا اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں جو نہ صرف شریف کنجاہی صاحب کی بحیثیت پنجابی ترجمہ نگار بلکہ پنجابی میں اعلیٰ معیار کے فکری نظام متعین کرنے کا باعث بھی بنے ہیں۔

کلاسیک اردو میں

کنجاہی صاحب نے جہاں ایک طرف پنجابی شعر و نثر کے دیگر زبانوں میں تخلیق ہونے والے

اعلیٰ ادب سے مالا مال کیا وہاں پر ہی انہوں نے پنجابی زبان میں سے اردو تراجم بھی کیے جن میں ''کہے فرید'' (بابا فرید کے کلام کا اردو ترجمہ ۱۹۷۸ء) اور ہیر وارث شاہ ۱۹۹۲ء) شامل ہیں اسی طرح انہوں نے جدید پنجابی شاعری سے انتخاب کو بھی اردو پیکر میں تشکیل دیا اور ترجمہ کو جیسے کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وہ اپنے لیے تخلیقی مسرت قرار دیتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں:

> ''ترجمے میں ایک ترجیح ہوتی ہے اگر کوئی بڑی کاروباری مجبوری نہ ہو مثلاً کوئی ادارہ مجھے کہتا ہے کہ ان صفحوں کے ترجمے کردو اس میں کوئی تخلیقی مسرت نہیں ہے وہ ایک مالی مسرت ہو سکتی ہے۔ لیکن جب میں خود کروں گا تو میری کوشش ہوگی کہ میں ترجمہ اس کا کروں جو مجھے پسند ہے۔۔۔۔''

اس نقطۂ نظر کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو شریف کنجاہی صاحب کے اکثر تراجم یوں لگتا ہے انہوں نے اپنی تخلیقی مسرت کے پیشِ نظر کیے ہیں۔ تاہم ''بابا فرید'' اور ''ہیر وارث شاہ'' کے ضمن میں ایک یہ خیال بھی آتا ہے کہ شریف کنجاہی صاحب اردو دان طبقے تک یہ بات پہنچانے کے خواہش مند بھی نظر آتے ہیں کہ وہ اس امر سے آگاہ ہوں کہ پنجابی میں کس قدر اعلیٰ و ارفع شعری ادب موجود ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہیں تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے گاہے بہ گاہے اعلیٰ پنجابی شہ پاروں کو دنیائے ادب کے قارئین کے سامنے لانے کی سعی کی ہے۔

مذہب کی طرف

''پنج سورہ'' منظوم پنجابی ترجمہ'' (۱۹۸۰ء) نبی پاک کے خطبے (۱۹۸۸ء) اور قرآن مجید کا پنجابی ترجمہ (۱۹۹۶ء، دو جلدوں میں) یہ ایسا کام ہے جو جناب شریف کنجاہی کی مذہبی عقیدت اور مذہبی علوم سے واقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

پنج سورہ (پنجابی) میں قرآن پاک کی پانچ مختصر اور طویل سورتوں کے آزاد پنجابی نظم میں ترجمے پیش کیے گئے ہیں۔

ان جملہ تراجم میں جو بات واضح اور صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ان تراجم میں محض لفظی سطح پر رسمی نوعیت ہی کا ترجمہ نہیں کر دیا بلکہ اپنی تمام تر محبتوں اور عقیدتوں کو انہوں نے اپنی محنتوں سے شنگھار اور سنوار کر پیش کیا ہے اور اس تقدس ادب آداب اور احترام کو ملحوظ خاطر رکھا ہے جو اس مقدس کلام کو ترجمہ کرتے ہوئے پیش نظر رہنا چاہیے تھے۔

رسول پاکؐ کے خطبات اور پنج سورہ کے تراجم میں یہ بات صاف نظر آ رہی ہے کہ انہوں نے کلام نبی اور کلام پاک کے سیاق و سباق میں لفظوں کے معنی مقرر کرنے کے بعد ان کے لیے مناسب پنجابی الفاظ تلاش کیے ہیں۔ عربی ایک کثیر لفظی اور بے پناہ وسعت کی حامل زبان ہے۔ اس میں جہاں ایک ہی جانور کے لیے کئی کئی لفظ موجود ہیں تو ساتھ ہی ایک ایک لفظ کئی کئی معنی دے رہا ہوتا ہے۔

عربی میں علوم کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہے۔ ان ہی خوبیوں کے باعث عربی زبان سے ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی بجا ہے کہ اب تک پنجابی زبان میں قرآن حکیم کے کئی ایک تراجم موجود ہیں لیکن جس تحقیقی اور علمی سطح کی ضرورت اس سلسلے میں رہتی ہے اور جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمیں شریف کنجاہی صاحب کی ذات میں بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ شریف کنجاہی صاحب نے درحقیقت پنج سورہ کا ترجمہ کر کے قرآن حکیم کے بھرپور اور خوبصورت ترجمے کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جو بعد ازاں پورے قرآن حکیم کے ترجمے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شریف کنجاہی صاحب نے نبی پاکؐ کے خطبات اور پنج سورہ کے ترجمے باعث ثواب و برکت کیے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کو پڑھنے کی صورت میں بھی ان کی ذات کے درجات کی بلندی کی دعا کی جاتی رہے گی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ماضی میں ہمارے لیے کئی ایک شعراء نے قرآنی آیات اور مذہبی کتب کا منظوم اور نثری ترجمہ کیا جس کی قرآت کا پنجاب میں رواج عام تھا۔ بلکہ زیادہ دُور کی بات نہیں جب ان تراجم کو ''رآ'' کے ساتھ صبح سویرے اٹھتے اور پھر عصر کے وقت قرآت کیا جاتا' جس کا بڑا مقصد محض یہی تھا کہ قرآنی آیات کے معنی و مفہوم اور مطالب کو سمجھ کر پڑھا جائے' تو ان تراجم کا مقصد بھی یہی تھا۔ امر افسوس ہے کہ اب قرآت کا وہ دستور عام نہیں رہا۔ دین سے بیگانگی کا ایک بڑا رویہ بھی شاید یہی ہے۔ لیکن شریف کنجاہی صاحب جو بذات خود جدید علوم سے کماحقہ واقف اور فیض یاب ہیں' وہ بھی اس ضرورت کو دائمی سمجھتے ہیں۔

پنج سورہ' جس کی اشاعت کا اہتمام مرکز تحقیق اسلامیہ زمیندارا ایجوکیشنل ایسوسی ایشن نے کیا تھا اور جسے نقوش پریس لاہور سے چھپوایا گیا۔ ایک انداز ملاحظہ فرمائیے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کملی والے

تھوڑا کو انھیا کر راتی

ادھ داوارا

اس نوں کجھ گھٹاوی سکنیں

بلکہ کجھ ودھاوی سکنیں

پر ہر صورت

کریا گڑتوں بچے بچے نال تلاوت

کیا' کمال حسن وخوبصورتی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے کہ چھوڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا!

شاہ دولہ دریائیؒ اور تصوف کے دیگر وسیلے

شریف کنجاہی صاحب کے اپنے ایک انٹرویو میں کی گئی اس بات پر نہ صرف غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے بلکہ نئے لکھنے والوں کو عملی زندگی میں اپنے افعال کو ان پر منطبق کرنے کی ازحد ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ پنجابی زبان کو صرف لوک داستانوں کی زبان نہیں رہنا چاہئے' اس کو اگر علمی زبان بنانا ہے تو علمی کتابوں کی طرف توجہ دی جائے۔ چنانچہ میں نے خطباتِ اقبال جو ان کے انگریزی لیکچرز تھے اور جو بڑی ثقیل چیز تھے' ان کا پنجابی ترجمہ کیا۔ محض اس لیے کہ میرا خیال تھا کہ شاید یہ جو واہگہ کے اس پار مسلمان یا سکھ بستے ہیں۔۔۔۔ کیونکہ سکھوں کے متعلق میرا نظریہ شروع سے یہ تھا کہ وہ سیاسی طور پر ہمارے مخالف رہے ہیں' ورنہ فکری طور پر مواحد ہیں' ایک خدا کو ماننے والے ہیں اور یہ ایک واحد مذہب ہے جس کی مذہبی کتاب کے آغاز میں مسلمان صوفی بابا فریدؒ کا کلام درج ہے۔ میرا خیال یہ تھا کہ وہ اس فکر سے متاثر ہیں۔۔۔۔''

اسی دور میں انہوں نے بابا فریدؒ کا روح سے مطالعہ کیا اور یہ بھی لگتا ہے کہ اسی دور میں انہوں نے صوفیاء کی تعلیمات کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اس بارے میں لکھا اور وہ ایک درویشی اور فقر کا رویہ جو

شریف کنجاہی صاحب کی ذات میں شروع سے موجود رہا ہے' اس نے اس کام کو بڑھانے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ان کی اور زیادہ مدد کی۔ پھر ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جس کو انہوں نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

''اکیڈمی نے مجھے کہا کہ پنجابی شاعری کا انتخاب کیا جائے اور اس کا اردو ترجمہ کیا جائے تاکہ جو پنجابی نہیں جانتے پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لوگ بھی اس کو پڑھ لیں۔ چنانچہ میں نے پھر اس کا ترجمہ کیا۔ پھر انہی دنوں مجھے ''لوک ورثہ'' والوں نے کہا کہ بابا فرید کے اشلوک ہیں' ان کو اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ ان کا ترجمہ ''کہے فرید'' کے نام سے شائع ہوا۔ اور پھر آخری ترجمہ کی کوشش جو میرے لیے قابل فخر اور میری متاع ہے کہ میں نے عمر کے اس حصے میں آ کر قرآن کریم کا پنجابی میں ''بلینک ورس'' میں ترجمہ کیا۔ اس سے پہلے پنج سورہ کا ترجمہ کیا تھا جو اس میں شامل ہو گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ایک آدمی بھی اس سے استفادہ کر سکے۔''

اگرچہ شریف کنجاہی صاحب نے اس قدر کام کیا ہے کہ فارسی کا یہ مقولہ ان پر پوری طرح فٹ آتا ہے کہ:

''ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند''

یہ اس لیے بھی درست ثابت ہوتا ہے کہ ان کا کام محض تراجم تک ہی نہیں محدود' بلکہ تصوف اور روحانیات کی راہوں میں بھی اور وہ تحقیق کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نظر نہیں آتے۔ لسانی' ادبی اور فکری تحقیق کے علاوہ ان کے اپنے ہی شہر گجرات کی عظیم ہستی حضرت شاہ دولہ دریائی پر تحقیقی کتاب ہے اور اپنی موضوعی تحقیق کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں انہوں نے ان کی روحانی کرامات کے تذکرے کے علاوہ ان کی علمی اور فکری شخصیت کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ایک بات جو اور زیادہ واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی ہے' ان جگہوں کی جغرافیائی تحقیق پر بھی پوری پوری توجہ دی ہے۔ جن کے ساتھ ''شاہ دولہ دریائی'' کا تعلق رہا ہے۔

اور صرف یہیں تک ہی نہیں' گجرات جو ایک عرصے سے علمی ادبی سرگرمیوں کا مرکز چلا آ رہا ہے' عہد اکبر سے اور اس قلعے کی تعمیر کے زمانے سے' جو اکبر نے تعمیر کروایا تھا' کسی نہ کسی سطح پر ہر عہد کے

حکمرانوں کے لیے یہ توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ شہر گجرات تو شاید درباری زندگی کا زمانہ بھی رہا ہو یہاں اور اسی مناسبت سے یہاں علم و ادب فروغ پاتا رہا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا کنجاہ کا شاعر ''غنیمت کنجاہی'' فارسی میں شعر کہتا تھا اور پھر آج کے شریف کنجاہی صاحب تک کتنے ہی لوگ ہیں جنہوں نے فارسی زبان کو شعر گوئی کا ذریعہ بنایا۔ صوفیا، عشاق اور اہل علم کی یہ سرزمین علم و عرفان کا خزینہ قرار دی جاتی رہی ہے تاہم شاہ دولہ دریائی جیسے صاحب کشف و کرامت صوفی کے اس واقعہ کی آئینہ دار بھی رہی ہے۔ یہ واقعہ جو شاہ دولہ دریائی سے متعلق کرامت نامہ شاہ دولہ صفحہ ۱۴۱ پر درج ہے:

''آپ نے دو نان روغنی اور عصائے چوبی اورنگ زیب کو مرحمت کیے اور فرمایا یہ عصائے چوبی اور نان روغنی تم کو درگاہ رب العالمین سے مرحمت ہوتے ہیں، خاطر جمع رکھو۔''

اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ ریاست معاملات میں براہ راست مداخلت کی حیثیت رکھتا ہے تاہم صوفیاء کے نزدیک ایک شاہ کا دربار اور ایک گدا کی جھونپڑی ایک برابر ہوتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بابا فرید تو اپنے ایک شلوک میں کچھ یوں فرماتے ہیں۔ یہ حوالہ اس لیے بھی دیا جا رہا ہے کہ شریف کنجاہی صاحب بابا فریدؒ پر بھی قابل ستائش کام کر چکے ہیں:

فریدا روٹی میری کاٹھ دی، لاون میری بھکھ
جنہاں کھادیاں چوپڑیاں، گھنے سہن گے دکھ

''اے فریدؒ، میری روٹی لکڑی کی ہے اور میری بھوک اس کے لیے سالن ہے۔ (شاید یہ سب اس لیے بھی ہے کہ بابا فرید مسعود الدین گنج شکرؒ یہ جانتے ہیں کہ وہ جو چوپڑی کھائیں گے وہی آگے جا کر زیادہ دکھ سہیں گے)''

یہ صاحبان علم و دانش اور فقر و غنا کے مالک جو اپنے کلام میں ہمیشہ ان استعاروں، علامتوں اور تشبیہوں کو استعمال کرتے ہیں جو عام لوگوں کی زندگی کے روزمرہ استعمال میں ہوتے ہیں۔۔۔۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ شریف کنجاہی صاحب کو فقط علمی، ادبی، تحقیقی اور فکری طور پر ہی تعلق نہیں وہ تو جذب و کشف، فقر و مستی، درویشی و فقیری میں اسی سلسلے کی ایک کڑی دکھائی دیتے ہیں جو بابا فریدؒ سے مخصوص ہے اور جو شاہ دولہ دریائی سے مخصوص ہے تو درست ہوگا۔۔۔۔! اور شریف کنجاہی

صاحب کی یہ تصنیف ''حضرت شاہ دولہ دریائی گجراتی' حیات وتعلیمات'' جو مرکزِ معارف اولیاء محکمہ اوقاف پنجاب لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ جس کا نام ہی درحقیقت ایک اظہاریہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں حضرت شاہ دولہ دریائی کی حیات وتعلیمات کا تفصیلی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔

کرامت نامہ۔ جو حضرت شاہ دولہ دریائی کی زندگی کے اوران کی کرامات کے حوالے سے مستند تصنیف جانی جاتی ہے جو ۱۱۳۲ھ میں ترتیب دی گئی اس کے مطابق شاہ دولہ دریائی کا سنِ وصال ۱۰۸۲ھ ہے۔ کرامت نامہ کا مصنف مشتاق رائے پہلے ہندو تھا۔ مشرف بہ اسلام ہوا اور ان کرامات کو رقم کرنے لگا جو اس کے دائرۂ اسلام میں آنے کا باعث بنی تھیں۔ مسلمان ہونے کے بعد اس کا نام امان اللہ رکھا گیا۔ حضرت شاہ دولہ دریائی نے اس کے کرامت نامہ کا حسنِ تحریر دیکھ کر اسے ''سعدی ثانی'' کا نام دی تھا۔ کرامت نامہ کے کئی حصے ہیں جو منظوم ومنثور ہیں۔

شریف کنجاہی صاحب نے اپنی تصنیف میں بے شمار نکات اٹھائے ہیں۔ کنجاہی صاحب کے نزدیک شاہ دولہ کا نام محمد قاسم تھا۔ کنجاہی صاحب کی تصنیف کے تعارف میں وحید قریشی نے جن اہم کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو کہ حضرت شاہ دولہ دریائی کی حیات وکرامات اور تعلیمات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان میں کرامت نامہ (محمد چراغ قادری) کرامت نامہ (مشتاق رائے) صاحبیہ (جہاں آرا) مراۃ العالم (محمد بختاور خان) تاریخ ارادت خاں (مبارک اللہ واضح) تاریخ خان جہانی (نعمت اللہ ہروی) شاہجہاں نامہ (عبدالحمید لاہوری) مآثر الامراء (شاہنواز خان) خلاصۃ التواریخ (سبحان رائے بٹالوی) کیگوہر نامہ (رائے زادہ دنی چند) معارج الولایت (عبداللہ خویشگی)۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک کتب ہیں جو حضرت شاہ دولہ دریائی کی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔ اور جو شریف کنجاہی صاحب کے مطالعہ میں رہی ہیں۔ علم وتعلم اور مطالعہ کا یہی ذوق وشوق ہے جو شریف کنجاہی صاحب کو معاصر ادباء میں نمایاں ترین مقام عطا کرتا ہے۔۔۔۔!

تحقیق کا علامتی نظام۔ "لفظوں کی عینک"

شریف کنجاہی صاحب کی تصنیفات میں ایک نہایت اہم کتاب ''تاریخِ گجرات''۔ لفظوں کی عینک'' ہے۔ جو نہ صرف ان کے تحقیقی کام کے سلسلے میں اہمیت کی حامل ہے۔ بلکہ اپنے نام مین انفرادیت کے باعث بھی اپنے اندر توجہ رکھتی ہے۔ خاص طور پر ''لفظوں کی عینک'' اپنے اندر جو علامتی اور استعاراتی کشش رکھتی ہے' اس کا جواب نہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ کتاب بھی ''شاہ دولہ دریائی'' کے سلسلے کی ایک کڑی معلوم دیتی ہے۔ اور پھر یہ احساس بھی اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے کہ یہیں سے کنجاہی صاحب نے اپنے اس سنجیدہ تحقیقی کام کا آغاز کیا جو ''سکینڈے نیویا کے لسانی رابطے'' میں اگر آغازِ کار کے طور پر شامل تھا تو ''رگ وید۔۔اک جھات'' میں اور زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا۔۔۔ اگرچہ ان کی اس کتاب ''تاریخِ گجرات۔۔۔ لفظوں کی عینک'' کو زیادہ تر موضوع بحث نہیں بنایا گیا ہے۔ تاہم ایک خاص حوالہ جو تاریخ میں آباد قدیم شہروں کو دیکھنے اور جانچنے کا وسیلہ رہا ہے اور وہ ہے آبی وسیلہ' آبی حوالہ۔۔۔۔۔ اور اس آبی حوالہ کو اہم سمجھتے ہوئے انہوں نے تاریخِ گجرات کو دیکھنے کی سعی کی ہے اور اس سلسلے میں یہ بھی کہا ہے:

''انسانی زندگی میں ہی نہیں بلکہ نباتاتی زندگی کے لیے بھی پانی بنیادی چیز ہے۔ اس لیے میری سوچ ادھر گئی کہ انسان نے سب سے پہلے اپنے ٹھکانے وہاں رکھے جہاں اس نے پانی دیکھا۔ اس کا اشارہ قبل ازیں بھی میں نے اپنی دو تحریروں میں کیا تھا۔ اور اس میں مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ

بات کافی حد تک ٹھیک ہے کہ انسان نے سب سے پہلے جو ڈیرے بنائے وہ آبی تھے۔۔۔۔۔
ابتدائی دور میں کسی سفر پر جاتے ہوئے بتانا یا دوسرے سے معلوم کرنے کے لیے کہ بھائی میں کون
ہوں' کہاں کا رہنے والا ہوں اور کہاں جانا ہے۔ اسطرح کاموں کی اہمیت بن گئی۔''

بات صرف یہیں تک محدود نہیں' بلکہ اس حوالے سے تاریخ اور تاریخ سے جڑے جغرافیے کو
دیکھنے کی ایک اپنی اہمیت تھی۔ جس کو کنجاہی صاحب نے موضوع بنایا ہے۔

دودِ دل' چراغ محفل

پنجابی اور اردو کے معتبر شاعر۔ ادیب اور دانشور ہوتے ہوئے' فارسی شاعری سے ان کا تعلق' ان
کے صاحب علم ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ موجودہ عہد میں فارسی شعروادب سے شغف رکھنا' اسے پسند
کرنا' اسے پڑھنا ایک دوسری بات ہے لیکن فارسی میں خود لکھنا قطعی دوسری بات ہے۔

شریف کنجاہی صاحب فارسی میں شعر کہتے ہیں اور ان کا ایک فارسی شعری مجموعہ چھپ چکا ہے۔
''دودِ دل'' کے نام سے۔ یہاں ایک سوال اپنے طور پر سامنے آتا ہے کہ شریف کنجاہی صاحب
اگر غنیمت کنجاہی کے خطے سے تعلق رکھنے کے باوجود فارسی میں شعر نہ کہتے تو یہ بات ان کی ذات
میں بے شمار خوبیاں ہونے کے باوجود ایک کمی کی سی حیثیت رکھتی۔۔۔ یہ مجموعۂ کلام ۱۹۹۷ء میں
چناب اکیڈمی نے سجاد پرنٹنگ پریس گجرات سے چھپوایا۔ ان کا اپنا خیال تو یہ ہے کہ'' وہ نظامی
عروضی کے معیار پر بھی پورا نہیں اترتے۔ عروضی نے ادیب و شاعر کے لیے گوناگوں علوم وفنون
سے آگہی اور شعر واصناف پر مکمل دسترس کو لازمی قرار دیا ہے۔''

اگر چہ فارسی زبان وادب بھی اپنے لیے ایک خاص انتظام وانصرام کی حامل شخصیت کی ڈیمانڈ
کرتا ہے تاہم یہ سب کچھ شریف کنجاہی صاحب کی ذات میں نہ صرف ناپید ہے بلکہ ان کی سادگی
اور سادہ مزاجی ان عارضی لوازمات کی نفی کرتی ہے بلکہ اس سب سے بڑھ ان کے پیش نظر انسان
کی محرومیاں' ناامیدیاں اور مایوسیاں نظر آتی ہیں۔۔۔ بلکہ اپنی زندگی کے اس طویل اور طول سفر

میں وہ ان انسانی دکھوں کو دیکھتے آئے ہیں اور یہ سوال اپنے ادب میں اٹھاتے آئے ہیں کہ آخر یہ سب کیوں ہے؟ اور یہی عناصر ان کی شاعری میں روشن چراغوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

پنجابی اور اردو شاعری کی طرح اگر دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا تعمیر کرنے کے خواہش مند ہیں جہاں آدرشوں کو ان کی منزل ملے' نصب العین اور کومٹمنٹ حقیقی اور ٹھوس معنوں میں دنیا پر اجاگر ہوں اور انسان ابدی اور مستقل راحتوں سے ہمکنار ہو۔

''شریف آمد صدائی از کجائی
کہ دارد لحن وطرز آشنائی
معا برگشتہ یوسف را دیدم
فغاں بے اختیارم کشیدم

کسی بھی شاعر کے شعری ویژن' اس کے فکری اور فنی نظام اور اسلوبیاتی طریقۂ کار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے کلاسیکی اور روئتی شعری ورثے سے کس قدر جڑا ہوا ہے۔ اور دوسری بات جو اس کے بھرپور تجربات کی آئینہ دار ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ کسی بھی دوسرے دیس اور ملک کی زبان میں بات کر رہا ہو لیکن اس میں اس کا فوک وزڈم اور لوک دانائی کا ورثہ سانس لے رہا ہو جو درحقیقت اس کی پہچان' اس کی شناخت ہو۔ اگر ''دو دِل'' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بہت نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان کے ہاں کلاسیکی رویے اور فکری نظام وہی کا وہی کارفرما ہے جو اس دھرتی 'دھرتی کے لوگوں' شاعروں' ادیبوں اور دانشوروں کا رہا ہے۔

اور فارسی غزل کا جدید نظام اور جدید رجحان جو آج اس کی تازگی کا احساس اپنے اندر رکھتا ہے' وہ بھی شریف کنجاہی کی غزل کا خاصہ ہے اور قدیم کا حسن بھی اس کی شاعری میں ملتا ہے۔

خوش گفت بہ شمع بزم شبی آن کرمکِ جاں در باختہ ای
سوز تو ضیا گردید کہ تو ای جاں غم پروانہ خوری !!!

'رگ وید' پر

اس خطے کے دیگر بے شمار علوم کی طرح ''رگ وید'' کے بارے میں ان کی تحقیق سے ان کے عظیم انسانی علوم سے دلچسپی کا پتہ ملتا ہے۔ دوسرا ان کے اندر جو روحانیت کے اثرات ہیں انہوں نے نہ صرف یہ کہ انہیں اپنے مذہبی اور روحانی علوم سے ہم آہنگ و ہم مزاج کر دیا بلکہ دیگر مذاہب میں شامل روحانی کتب اور روحانی عناصر میں بھی اس درجہ غرق کر دیا کہ انہیں تحقیق جیسے مشکل امر پر ابھارا اور وہ اس سلسلے میں دُور تک نکل گئے۔ اس سلسلے کی کڑی ہے ''رگ وید۔۔۔۔۔ ایک جہات بھی''

اس سلسلے میں شریف کنجاہی صاحب جو دلیل دیتے ہیں وہ بھی بہت صائب اور معتبر نظر آتی ہے کہ جب تک ہم دیگر مذاہب کے بارے میں نہیں پڑھیں گے ان کی مذہبی کتب کو نہیں سمجھیں گے، تو دوری اور تعصب ختم نہیں ہو سکے گا۔ جو انسانوں کے درمیان پیدا ہو چکا ہے۔ کنجاہی صاحب کے اپنے خیال میں:

> ''رگ وید بنیادی طور پر وہی تعلیمات لیے ہوئے تھی جو بعد میں آنے والی الہامی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس سے دوری کا بنیادی سبب یہ ہے کہ براہمن جنہوں نے نہ خود اس کو پڑھا نہ دوسرے کو پڑھنے اور سمجھنے کی طرف لگایا''

اور ویدوں کے علم ان کی زبان اور موضوع سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ زبان کے اصل اور ماٰخذات اس کے جاننے والوں سے پڑھنے اور لکھنے والوں سے اور ان کے تعصب اور مزاج سے مکمل آگہی بھی حاصل ہو۔ جس طرح کہ ہم جانتے 'وید'' سنسکرت زبان میں لکھے گئے اسی مناسبت سے اسے ویدک' یا ویدی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ ماہرین لسانیات کے نزدیک زبانوں کے کل ۱۲۔ خاندان ہیں۔ جن میں سے سنسکرت کا تعلق ہند یورپی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانوں سے بتایا جاتا ہے جبکہ باقی خاندانوں میں منذاری خاندان' دراوڑی خاندان' ہند یورپی خاندان' سامی خاندان' آسٹرک خاندان' تبتی چینی خاندان' امریکی حبشی خاندان' ملائی پول نیسی خاندان' یورالی خاندان' الطائی خاندان' بنتو خاندان اور دردی خاندان۔

ویدوں سے دوری' خود اس کے ماننے والوں اور دنیا والوں کی وجہیں دو بنتی ہیں۔ پہلی وجہ تو سنسکرت زبان میں موجود وہ لسانی مشکلیں ہیں اور دوسرا خود ان پنڈتوں اور پروہتوں کا رویہ ہے جو انہوں نے اسے عام لوگوں سے دُور رکھنے کے لیے روا رکھا۔

ایک تصور جو اس زبان اور ویدوں کی قدامت کو ظاہر کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ جب آریا لوگ رگ وید تخلیق کر رہے تھے' تب تک باہمن چاری بھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ باہمن چاری تو گنگا اور جمنا کی وادی میں بڑھی اور پھیلی' پھلی۔

وید چار ہیں' رگ وید' اتھر وید' سام وید اور یجر وید۔ ایک تصور جو کافی مضبوط تصور کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ چاروں وید پنجاب میں تخلیق کیے گئے جبکہ اک اور تصور کے مطابق صرف رگ وید پنجاب میں تخلیق کیا گیا جبکہ باقی وید گنگا اور جمنا کے دوآبے میں لکھے گئے۔ یہ وید ایک انتہائی اہم لسانی دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ کہ سنسکرت اور اس کی جڑواں زبانوں سے آشنا ہونے کے لیے اور ان کی اہمیت سے آگاہ ہونے کے لیے ان ویدوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

ان ویدوں کی جہاں اور بے شمار اہمیتیں بنتی ہیں وہاں پر ہی شہری آئین' دستور' مذہبی رسم ورواج' اساطیری تصورات وخیالات' تہذیبی وتمدنی طور طریقے' فوجی زندگی' مقامی قبیلوں کے آریاؤں کے ساتھ جنگوں اور امن وامان سے رہنے کے حالات بھی کچھ تفصیل سے ملتا ہے۔

سلیم خاں گمی نے اپنی کتاب'' پنجابی زبان دا ارتقاء'' میں بتایا ہے کہ'' ویدی زبان کے بولنے والے آریا ۲۰۰۰ ق م میں افغانستان کے پوربی حصوں' بلوچستان' سندھ' اور پنجاب میں آباد تھے۔ اس کے بعد وہ گنگا اور جمنا کی وادی میں چلے گئے۔ لیکن سبھی نہیں گئے۔ کیونکہ آبادی بڑھ گئی تھی' اس

لئے کچھ پنجاب میں رہے اور باقی مدھیہ پردیش (وسط ہند) میں جا بسے۔

اسی حوالے سے اس زبان کا اور یہاں رہنے والے لوگوں کا تا گہرا تعلق بنتا ہے جسے تاریخی اور جغرافیائی حوالے سے ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ ماہر لسانیات نے اور ماہرین آثار قدیمہ نے بھی' پنجابی سے سنسکرت کے تعلق کو معروف ماہر لسانیات محمد آصف خان نے اپنی تصنیف '' پنجابی بولی دا پچھوکڑ'' میں علیحدہ طور پر بیان کیا اوان نظریوں کو تائیدی طور پر بیان کیا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ

(۱) پنجابی سنسکرت میں سے وجود میں آئی اور سنسکرت نے چار ویدوں کی زبان ویدک یا ویدی کی کوکھ میں سے جنم لیا۔ پھر یوں ہوا کہ سنسکرت پنڈتوں اور پروہتوں کی زبان بن گئی۔ یعنی پہلے پراکرت (بول چال کی زبان) کا درجہ حاصل کیا اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کر گئی۔

(۲) دوسرا نظریہ ہے کہ آریا پنجاب میں آئے تو یہاں کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے اور ایک زبان پہلے سے بولتے تھے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ پنجابی کا قدیم اسلوب تھا۔ پھر وہ آریاؤں کی زبان ویدک بولنے لگے اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ اس طرح جس طرح ویدک کی بہتر شکل سنسکرت ٹھہری اور اس سے یہ مطلب بھی نکلا کہ سنسکرت اور پنجابی بہنیں ہیں۔

(۳) تیسرا نظریہ یہ کہ پنجابی منڈا قبیلوں کی زبان منڈاری اور دراوڑوں کی سانجھی تخلیق ہے۔ اس نظریے کو پنجابی کے بارے میں پاکستانی نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔

اور اس کے محرک عین الحق فرید کوٹی ہیں:

(۴) آخری اور تازہ ترین نظریہ یہ ہے کہ پنجابی نہ ویدک میں سے نکلی ہے اور نہ سنسکرت میں سے۔ کیونکہ نہ تو ایک زبان دوسری میں سے نکلتی ہے اور نہ کسی دوسری زبان میں مدغم ہوتی ہے۔ یہ منڈاری اور دراوڑی قبیلوں کی زبان بھی نہیں۔ یہ درست ہے کہ منڈاری لسانی قبیلہ اور دراوڑی لسانی کنبے کے لفظوں کے ذخیرے میں سے پنجابی نے ان گنت لفظ ادھار لیے

لیکن لفظوں کے اشتراک کے سبب اسے منڈاری یا دراوڑی کنبے کی زبان
نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ ایک خودرو آزاد اور خودمختار زبان ہے جو منڈاری
اور دراوڑی کنبوں کی زبانوں سے بھی پرانی ہے۔ مطلب یہ کہ پنجابی'
پاکستان اور بھارت کی قدیم ترین زبان ہے۔

اس ساری تمہیدی گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ رگ وید جیسی عظیم علمی اثاثہ کو اگر شریف کنجاہی صاحب نے کھوجنے اور تلاش کرنے کی سعی کی ہے تو اس کی ایک اپنی افادیت بنتی ہے جس کا نہ صرف یہ کہ اس علاقے' علاقے کے لوگوں' تہذیب وتمدن اور کلچر سے گہرا تعلق بنتا ہے بلکہ ان عظیم مذہبی اور تاریخی' روحانی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وید اور شریف کنجاہی صاحب نے اس پر کام کر کے ایک اہم ادبی وتہذیبی فریضہ نبھایا ہے۔

اور شریف کنجاہی صاحب اپنے اس تھیسس میں جو انہوں نے اس حوالے سے آگے بڑھایا' اس امر پر جہاں تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ''وید'' ہی وہ علمی سرمایہ ہے' جس کو کم سے کم شائع کیا گیا اور شعوری کوشش کی گئی کہ اسے لوگوں کے مطالعہ میں نہ لایا جائے حالانکہ اگر ایسی ہی کوئی بات تھی تو پھر ایسی علمی اور فکری بحثوں کو جو انسانی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں' موضوع ہی کیوں بنایا گیا۔ اور پھر اوپر سے اس سوچ کا اظہار بھی کیا جاتا ہے کہ بعض باتیں پہلے سے ہی ویدوں میں ایسی ہیں کہ جو زیادہ سے زیادہ زمانے کا ساتھ بھی نہیں دے سکتی ہیں۔ جہاں تک ان ویدوں کو زیر مطالعہ لانے کی بات ہے تو اس سلسلے میں شریف کنجاہی صاحب نے ایک نہایت دلچسپ بات کی ہے کہ:

''میں غیر ہندو ہونے کے ناتے یہ حق تو نہیں رکھتا کہ ان پر کوئی رائے زنی
کروں یا تبصرہ کروں' پھر ایک علمی سوال جانتے ہوئے میرا یہ خیال ہے کہ
''رگ وید' اس وقت کے دانشوروں کی دانش کا نچوڑ تھا۔ اسے ہندو رشیوں
نے لکھا۔''

شریف کنجاہی کے نزدیک ان رشیوں میں کوئی باہمی ربط نظر نہیں آتا۔ تاہم اس بات سے وہ متفق نظر آتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے دانشور تھے۔ ان کے سامنے بھی یہ مسئلہ تھا کہ دنیا' یہ کائنات' یہ انسان کیا ہے۔ اس کا شروع اور انت کیا ہے؟ اور اس کو سکھوں کا گہوارہ بنانے کے لیے بہترین حل پیش کیے گئے ہیں شاید یہی وجہ بنتی ہے شریف کنجاہی صاحب نے اس اہم کتاب کو اس قابل سمجھا اور اس پر کام شروع کیا۔

تعلیم سے وابستگی

شریف کنجاہی صاحب تعلیم سے وابستہ رہے ہیں اردو اور پنجابی زبان وادب کے لیے گراں قیمت خدمات سرانجام دی ہیں۔ تحقیقی، تنقیدی، علمی، ادبی اور سوانحی حوالوں سے بے شمار کتب تخلیق کی ہیں۔

ان کی ایک اہم کتاب (اسکینڈے نیویا کے لسانی رابطے) بھی ہے جس میں انہوں نے زبانوں اور خاص طور پر لفظوں کے درمیان اشتراک کو موضوع بنایا ہے۔ اور خالصتاً اپنا نقطۂ نظر سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں اپنی حد تک وہ کامیاب نظر آتے ہیں اور نامور مترجم شاہد حمید کے ایک مستند مضمون ''ترجمے کے مسائل'' کے پیش نظر یہ کتاب ہمیں اہم لگتی ہے۔

''الفاظ ہوں یا تراکیب، محاورے ہوں یا ضرب الامثال ان سب کے پیچھے پوری تاریخ ہوتی۔ یوں اس طرح ان کے ساتھ طرح طرح کی یادیں، جذبات، روایات وغیرہ وابستہ ہو جاتی ہیں۔ انگریزی میں انہیں Connotations کہا جاتا ہے (اردو میں آپ انہیں تلازمات کہہ سکتے ہیں)''

اس بات کے پیش نظر بھی دیکھا جائے تو شریف کنجاہی صاحب کا ''رگ وید۔ اک جھات'' اور ''اسکینڈے نیویا کے لسانی رابطے بے حد اہم نظر آتی ہے۔

کچھ مشترک پہلو

اگر سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہماری معاصر ادبی تاریخ میں کوئی شخصیت ایسی نظر نہیں آتی جو شریف کنجاہی کی طرح گوناگوں حیثیتوں اور بے شمار پہلوؤں کی حامل ہے۔ ایک طرح کی طغیانی ہے جو ان کے دریائے وجود میں نظر آتی ہے جو اپنی موجوں سے علوم وفنون کے ذخیروں کو سیراب کرنا چاہتی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ جستجو' یہ تلاش' یہ کھوج اور یہ تحقیق جو ان کی ذات میں نظر آتی ہے جو ہمیں ان کے ایک اور ممدوح اور صدی کے بہت بڑے دانشور برٹرینڈ رسل کے یہاں بھی نظر آتی ہے اور جس طرح برٹرینڈ رسل کو ساری زندگی تھل کی عظیم دیوی کے قدموں میں بیٹھنے کے بعد شعور حاصل ہوا کہ اس دیوی کی پکڑ بھی بڑی محدود ہے اور اس نے انسانی ذہن کی حدیں اور ان کے موضوع پر پوری کتاب لکھ ڈالی۔

اور پھر لفظوں کی تلاش' ان کی جڑوں سمیت ہمیں شریف کنجاہی صاحب کے یہاں بھی ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی کیٹس کے یہاں:

''مجھے لفظوں سے اتنا ہی پیار ہے جتنا لوگوں کا اپنے زندہ دوستوں کے ساتھ ہوتا ہے''

شریف کنجاہی صاحب کی اپنی شاعری وہ اردو میں ہے یا پنجابی میں' فارسی میں ہے یا وہ شاعری کے منظوم تراجم ہیں' نثری تراجم ہیں یا تحقیقی کام' تنقیدی جھاتیاں ہیں یا پھر اسکینڈے نیویا لسانی

رابطے۔ سب جگہ ہمیں ایک بات بڑی واضح اور صاف نظر آتی ہے کہ انہیں لفظ سے بے حد محبت ہے اور وہ لفظ کی حرمت سے اس کے تقدس سے کماحقہ آگہی رکھتے ہیں۔ لفظ جس کی حرمت کی قسم خدائے ذوالجلال نے خود قرآن حکیم میں کھا رکھی ہے۔ شریف کنجاہی صاحب لفظ کی قوت سے آگاہ ہیں اور اس آگہی نے انہیں مختلف زبانوں' زمینوں' علوم' افکار اور خیالات سے واقف ہونے' انہیں سیکھنے اور اپنے خیالات کا حصہ بنانے پر مائل کیا۔ ان کے ادبی اور تخلیقی قد کاٹھ کا یوں تو ہر کوئی واقف ہے تاہم اردو ادب کے اہم نام ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کہ انہوں نے دوست احباب کے خاکوں پر مشتمل ایک بے حد خوب صورت کتاب تصنیف کی ہے ''آنگن میں ستارے'' جسے شہرزاد کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس میں ''شریف کنجاہی صاحب'' کے بارے میں موجود خاکے کا عنوان بھی ''شریف کنجاہی'' ہی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کنجاہی صاحب پر لکھے جانے والے جملہ خاکے اور مضامین کی نسبت یہ بھرپور اور خوب صورت ہے تو بہتر ہوگا۔ اس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''شریف صاحب بڑے سادہ اور معصوم انسان ہیں۔ ان کی شخصیت میں بچوں کی سی معلوم مسکراہٹ اور سادگی ہے۔ ہر چند کے وہ بڑے شاعر ہیں' علمی انسان ہیں' ان کے بے شمار مداح ہیں لیکن وہ اپنے کمالات کو چھپائے رہتے ہیں' ہر کس و ناکس پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔
> حضرت سلطان المشائخ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ جس طرح انبیاء پر معجزے کا اظہار فرض ہے۔ اسی طرح اولیاء پر کرامت کا اخفاء فرض ہے۔ شریف صاحب اس مقولے پر پوری طرح کاربند ہیں۔ کبھی اپنے علم' شاعری یا برگزیدگی کا اظہار نہیں کرتے۔ بس اپنی ذات میں کھوئے رہتے ہیں۔''

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ شریف کنجاہی صاحب کا شمار بڑے شاعروں اور اسکالروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ان کی فارسی شاعری بھی اہم ہے۔۔۔۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پنجابی زبان ادب میں ان کی شخصیت اب ایک متھ کی سی حیثیت اختیار کر گئی ہے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اور ادبیات کے شعبے میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں زندگی میں اتنا احترام اور تقدس ملتا ہے۔۔۔۔۔!

پاکستانی پنجابی شاعری

شریف کنجاہی صاحب کے اس تخلیقی و تدوینی سفر میں ''پاکستانی پنجابی شاعری'' کا انتخاب نہایت اہم حیثیت کا حامل انتخاب ہے اور شریف کنجاہی صاحب کی زندگی ہی میں کیوں' خود پنجابی شاعری کے لیے اس کتاب کا سامنے آنا' اس کا دستاویزی ثبوت حاصل کر لینے کے مترادف ہے۔

بڑے سائز کے ۵۴۴ صفحات پر مشتمل اس انتخاب کو محکمۂ اطلاعات' ثقافت و امور نوجوانان' حکومت پنجاب' لاہور نے نہایت عمدگی اور نفاست کے ساتھ شائع کیا ہے۔۔۔۔۔اور کنجاہی صاحب نے اس کو چار واضح حصوں میں تقسیم کیا ہے جن میں (ا) پنجابی شاعری دی ٹو' جس میں ابتدائیہ' پہلا دور' دوسرا دور' تیسرا دور' چوتھا دور اور پانچواں دور شامل ہیں۔ (۲) سخنور عورتاں دی شاعری (۳) پنجابی شاعری دا انتخاب (۴) سرائیکی شاعری دا انتخاب' شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے عورتوں کی شاعری کا انتخاب علیحدہ سے دے دیا ہے اور آخر پر سخنوروں کی فہرست بھی شامل کر دی ہے۔

اس کتاب کو اس وقت کے ڈپٹی سیکرٹری انفارمیشن منصور سہیل نے اپنی خصوصی دلچسپی اور توجہ سے چھپایا اور سیکرٹری اطلاعات اور نامور کہانی کار اور ناول نگار طارق محمود نے اس انتخاب کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا: (ترجمہ)،

(ا) پنجابی شاعری کا یہ پہلا مجموعہ ہے جس کو ہم پورے پنجاب کا انتخاب

کہہ سکتے ہیں۔ اس مجموعے میں تقریباً سبھی اصناف شامل کی گئی ہیں اور پہلی بار عورتوں کی شاعری کو انفرادیت کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔
بہاولپوری لہجے کو بھی پہلی بار اس مجموعہ کا مان سمجھ کر شائع کیا جارہا ہے۔

جب کہ شریف کنجاہی صاحب جنہوں نے اس مجموعہ کو محض انتخاب ہی بنا کر پیش نہیں کر دیا بلکہ اس میں پنجابی شاعری کی تاریخ ' ادوار اور ان ادوار میں رونما ہونے والے رویوں اور رجحانات کو بھی بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ دوسرا دور جسے انہوں نے (۱۹۵۸ء۔۱۹۷۰ء) میں تقسیم کیا ہے اس کے شروع میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

''پچھلی دہائی میں پاک پنجاب کی پنجابی شاعری کو ہم روایت سے جدت کی طرف چلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ طویل قافیے والی نظم سے چھوٹی اور بے قافیہ بنتر کی طرف آنے کے ساتھ اس میں موضوعات بھی شامل ہوتے گئے۔ پہلے جب اس صحن میں کوئی لڑکی نہیں داخل ہو سکتی تھی' اب اس کے لیے دروازے کھلنے لگے۔ تعلیم کے سلسلے میں وہ خود بھی زندگی کی راہ پر آنے لگیں اور پنجابی شاعری کا کسی نہ کسی رنگ میں انگ بن گئیں۔''

اگرچہ اس کتاب میں انہوں نے تقسیم سے مابعد کے شعراء کو موضوع بنایا ہے۔ تاہم چونکہ پنجابی نظم کا رشتہ کسی نہ کسی سطح پر صوفیاء کے ساتھ جا بنتا ہے اس لیے انہوں نے بابا فریدؒ' گورونانک' شاہ حسینؒ' بلھے شاہؒ' میاں محمد بخشؒ اور خواجہ غلام فریدؒ کے اثرات قبول کرنے والے شعراء کو بھی علیحدہ سے موضوع بحث بنایا ہے۔

پھر جو چند اہم موضوع اور واقعات کہ جن کے اثرات نے باقاعدہ طور پر پنجابی نظم کو متاثر کیا جیسے تقسیم' زبان میں تجربے کے اثرات' نئی زندگی میں در آنے والی نئی ضرورتوں کے اثرات' زندگی میں عورت کے نئے کردار اور بالآخر زندگی میں پیدا ہونے والی بے معنویت نے کس طرح پنجابی نظم میں اپنی جگہ بنائی۔ ان سب باتوں کو انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس انتخاب میں شامل کیا ہے۔
اور اپنے ساتھ احمد راہی' منیر نیازی' احمد ظفر' افضل پرویز' سلطان محمود آشفتہ' احمد سلیم' اشفاق احمد' افضل احسن رندھاوا' اشو لعل فقیر' اقبال سوکڑی' باقی صدیقی' لئیق بابری' سلیم الرحمٰن' سرمد صہبائی اور دیگر بے شمار لوگوں کا مطالعہ کیا ہے۔

جپ جی، گورونانک کے حضور

ایک کہ جن کے حضور حضرت علامہ اقبالؒ نے نہایت خوبصورت نظم کہی اور انہیں ان لفظوں سے خراجِ عقیدت پیش کیا:

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو پھر مردِ کامل نے جگایا خواب سے

تو یہ مردِ کامل جس کی فکر کا پنجاب کے کلچر اور زبان پر اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ گروؤں کا فیض ہی تھا کہ ان کی طرف سے ترتیب دی گئی ''گرنتھ صاحب'' کے توسط سے ہمیں بابا فریدؒ گنج شکر کا کلام میسر آیا۔ سو اقبال کے لفظوں میں صرف اہلِ پنجاب اور گورونانک کے ماننے والوں پر ہی نہیں اس پورے خطے اور اس خطے سے بھی بڑھ کر پوری دنیا کے انسانوں کے لیے

ضروری ہے کہ وہ گورونانک کے کلام سے آشنائی حاصل کریں۔ تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ اقبال ہی کے لفظوں میں گورونانک صاحب کا کلام اوران کے کلام میں پوشیدہ زندگی کا فلسفہ ابھی تو پوری طرح پنجابی زبان جاننے والوں پر بھی نہیں کھلا تو باقی زبانوں کے جاننے والے تو ابھی اس سے کتنے ہی دُور ہوں گے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو بذات خود سکرپٹ ہے۔ گورمکھی' سکرپٹ سے ناآشنائی اور پھر گورو صاحب نے تو اپنے کلام میں جو زبان استعمال کی سو کی' اس کی شرحیں لکھنے والوں نے اس میں سنسکرت اور پیچیدہ ہندی لفظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایڈجسٹ کیے ہیں کہ اب شرحوں کی شرح کی ضرورت ہے۔

شریف کنجاہی صاحب کی علمی اور تحقیقی طبیعت نے شاید اسی ضرورت کے پیش نظر ڈیڑھ سو (۱۵۰) صفحات پر مشتمل خوبصورت ترجمہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے کیا ہے۔ مزید اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے انہوں نے اس میں گورمکھی اور انگریزی ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔ کتاب کا انتساب کچھ ان لفظوں میں ہے:

''آج سے پانچ سو سال قبل پنجاب میں توحید کی بات کو دوبارہ بلند کرنے والے مردِ کامل گورونانک جی کے نام!''

ہرست میں جہاں ایک طرف سردار جسونت سنگھ کی بنائی گئی قدیم تصویر شامل ہے جو اب چندی گڑھ کے عجائب گھر اور ''گورونانک یونیورسٹی امرتسر'' کی زینت ہے وہ دی گئی ہے۔ بلکہ بعض ایسے عنوانات بھی دیئے گئے ہیں جن سے گورونانک کی فلاسفی کو سمجھنے کے لیے موجود جستجو کا اظہار ہو رہا ہے۔ جیسے ''جپ جی دل اک نظر'' جپ جی پنجابی ترجمہ: جپ جی اردو ترجمہ' بعض کھولنیاں (پیچیدگیاں سنوارنے کا کام' اور جپ جی انگریزی ترجمہ۔

شروع میں شامل دیباچہ جو سات صفحات پر مشتمل ہے اور جس کا عنوان ہے ''جپ جی دل اک نظر'' اس میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ گورونانک جی کے کلام' لفظوں اور لفظوں کے پس پردہ کار فرما آوازوں اور اس کے اسراروں کے ذریعے معنی تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس میں سے ایک اقتباس دیکھتے ہیں' جس سے میری اس بات کو تقویت ملے گی۔ لکھتے ہیں: (ترجمہ)

''تذکروں کے مطابق گورونانک جی ۱۴۷۰ء میں راوی کنارے آباد ایک بستی تلونڈی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام کالورام بتایا جاتا ہے۔ کنہیا لعل ہندی نے اپنی کتاب ''تاریخِ پنجاب'' میں آپ کے والد کا نام

یہی لکھا ہے۔ جب کہ انگریز مورخ جان کلارک نے اپنی کتاب The Sikhs میں یہی نام لکھا ہے۔ جبکہ ''مہا کوش میں سردار کاہن سنگھ نابھہ نے ان کا نام کالو چند لکھا ہے۔

میری سوچ کے مطابق لفظ کالو سے مراد تھی ''رب اس کو طویل العمر کرے'' حیات نانک کے لکھاری ڈاکٹر کالا سنگھ بیدی کا نام بھی یہی حوالہ رکھتا ہے۔ عمر کا تعلق پانی کے ساتھ ہونے کے سبب پانی کنارے کی بستیاں اور جگہیں اپنے نام یونہی چلاتی رہی ہیں۔ جیسے کالی گنج' کالی گھاٹ اور جہلم ضلع کی ایک جگہ میں'' کالا'' میں بھی یہ لفظ یہی مطلب دے رہا ہے۔''

پانی کے ساتھ آبادیوں کے ہونے اور ان کے ان پانیوں کی نسبت سے نام رکھے جانے کے تصور کو خود تقویت دی ہے شریف کنجاہی صاحب نے۔ اس کا اظہار وہ اس سے پہلے اپنی کتاب ''ضلع گجرات۔ لفظوں کی عینک'' میں بھی کر چکے ہیں۔ خیر یہ نقطہ نظر شریف کنجاہی صاحب کا اپنا ہے اور یقیناً اس کے لیے ان کے پاس دلیلیں اور وجوہات موجود ہیں۔ فی الحال ہم ان کی تصنیف ''جپ جی اک جھات'' کی طرف آتے ہیں' جو جنوری ۲۰۰۵ء میں سامنے آئی ہے۔ گویا یہ کتاب ان کے بارے میں موجود اس تصور کو تقویت پہنچاتی ہے کہ وہ آج بھی اسی محنت توجہ اور دیانت داری کے ساتھ اپنا تخلیقی و تنقیدی کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم ان کے کیے گئے ترجمہ کا مطالعہ کریں' اس ہی دیباچہ میں شامل ان کے لفظ ''نانک''' ''جپ'' اور'' گرو'' کے ان معنوں اور ان معنوں سے جڑے شریف کنجاہی صاحب کے قیاس کو دیکھتے ہیں کہ اس کتاب سے ان تین لفظوں کا تعلق بہت گہرا اور ازحد لازمی ہے۔ لفظ ''نانک'' کے بارے میں ان کا قیاس ہے' (ترجمہ)

(ا) یہی غلط فہمی نانک جی کے نام کے بارے میں بھی چلتی آئی ہے' میرے قیاس کے مطابق یہ آپ کا حقیقی نام نہیں تھا۔۔۔ ایلامی زبان میں nan سے مراد ہے سویر کی خبر دینے والا۔ چین میں نانکن اور نانگ' آبی حوالے رکھتے ہیں نن nen انگلستان میں ایک دریا کا نام بھی ہے اور یوں نانک سے شاید مراد اس زمانے میں تھی' پانی کی طرح لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے والا۔

(ب) لفظ ''جپ'' بھی ایک ایسا ہی لفظ ہے اس کا ترجمہ praise یعنی تعریف کیا گیا ہے۔ پر یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ لفظ بابا جی سے پہلے کس نے اور کب برتا تھا۔ میں اس لفظ کو جاپان کی طرف چلا تا ہوں جہاں ''جپ'' سے مراد ہے لفظ اور ڈکشنری کو جاپانی میں ''جبکی'' (Gibke) کہا جاتا ہے۔ اور ہم زبان کو جیبھ اس لیے کہتے ہیں کہ زبان ہی لفظوں کو ادا کرنے والا انگ ہے۔''

(ج) گرو بھی تحقیق کیے جانے کے قابل لفظ ہے ''رگ ویدی'' سمے میں اس سے مراد سورج تھا۔ یہ بہتر بھی لگتا ہے کہ قرآنی حوالے میں اللہ کو زمینوں اور آسمانوں کا نور کہا گیا ہے بلکہ جپ جی میں توحیدی باتیں ہی ملتی ہیں۔ اور اسی سے ہی علامہ اقبال نے گرو نانک جی کو 'وحدت کا گیت'' گانے والا کہا تھا۔ جس کا مطلب ہے اقبال نے بابا جی کو ضرور پڑھا ہوگا۔ اور اب میں ''آ ذ'' کو ''احد'' سے ملاتا ہوں کہ ''احد'' ہی ''آ ذ'' بن گیا ہو۔ اسی ''آ ذ'' کو سچ کہا گیا ہے اور سچ سے بابا فریدؒ نے حق ہی مراد لیا تھا۔''

تو یہ وہ نئی تحقیق ہے جو شریف کنجاہی صاحب لفظوں کے حوالے سے تاریخی تناظر میں کرتے ہیں اور پھر اس کا اطلاق بھی کرتے ہیں۔ اگر چہ محمد آصف خان کے کہنے کے مطابق تحقیق ایک ایسا موضوع ہے کہ اپنے تنوع اور بعد زمانی بُعد کے باعث اس میں ہمیشہ اختلاف کی گنجائش موجود رہتی ہے تاہم وہ باتیں جو تاریخی سچائیوں سے قریب تر محسوس ہوں اور جو اپنا فطری جواز بھی رکھتی ہوں انہیں تسلیم کر لینے میں قباعت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

اب ہم کچھ ''جپ جی'' سے ہی ترجمہ کی مثالیں دیکھتے ہیں۔ اس میں نہ صرف ہمیں کنجاہی صاحب کے ترجمے کا ذائقہ ملے گا بلکہ دانائی اور حکمت کے وہ موتی بھی دستیاب ہوں جو بابا گرو نانک کے کلام میں موجود ہیں۔ اور جن کی طرف علامہ اقبال اپنی نظم ''نانک'' میں اشارہ کر چکے ہیں۔ پہلا ترجمہ پنجابی سے۔ عنوان ہے ''ست کار''

''اوہ ست نام ہے خالق سبھ دا
جس نے ہے ہوا بنائی
اوہ اکال ہے
اوہ اجونی
اوہ سے بھنگی
ہر کسے دا اوہو رازق

اس چپن نجپیندے جادو
اوہ احدای سچا جانو
اس نوں منن والے نوں وی سچا جانو
اج وی سچا
کل وی ہے سی اوہوا سچا
نانک اکھے
جیہڑا اس نوں منن والا
اوہ بھی سچا!

اور اب سننے' کہنے اور چپ رہنے کے بھید سے واقف بندوں کے بارے میں دیکھئے کیا کہتے ہیں گرو نانک اور کیا خوبصورت ترجمہ کیا ہے شریف کنجاہی صاحب نے:

"گرست اشنانوں کی برکت
سننے ہی سے ہاتھ آئے
سننے اور دہرانے ہی سے مان ملے ہے
سننے والا ایک دھیانی ہو جاتا ہے
بھگت سدا خوشحال رہے ہے
سننے سے دکھ پاپ ہرن ہوتے ہیں نانک۔۔۔"
"کہنے کا گن دھکے سے کب حاصل ہووے
چپ رہنا بھی اپنے بس کی بات نہیں ہے
دھکے شاہی سے بھی یہ گن کب ملتا ہے
دھکے شاہی سے کب کوئی راجا ہووے
دولت پائے
ہر کسی کا من اگرچہ اس کو چاہے

ترجمہ القرآن الحکیم

جس طرح کہ ڈاکٹر اسلم رانا نے اپنے مضمون ''شریف کنجاہی دی شخصیت تے علمی و ادبی خدمتاں'' مطبوعہ ''لہراں'' دسمبر ۱۹۹۴ء شریف کنجاہی نمبر میں پنجسورہ کے ترجمہ کے حوالے سے کہا تھا:

> ''عربی زبان میں علوم کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور ادبی حیثیت میں اس کے کمالات کو دنیا تسلیم کرتی ہے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے عربی سے ترجمہ اور وہ بھی پنجابی زبان میں' پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر بہانے والی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پنجابی میں قرآن مجید کے پہلے بھی تراجم کیے گئے ہیں لیکن جو تحقیقی اور علمی سطح پر شریف کنجاہی نے پنجسورے میں ترجے کی بنیاد رکھی ہے' اسے سامنے رکھ کے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام کتنا مشکل ہوگا اور شریف کنجاہی کے عزم' حوصلے اور ذہنی قوت کی داد دینا پڑتی ہے۔۔۔''

یہ ۱۹۹۴ء کی بات ہے اور ٹھیک دو سال بعد محترمہ خالدہ یوسف (دختر شریف کنجاہی صاحب) نے قرآن حکیم کا پنجابی ترجمہ شائع کر دیا مع اصل (عربی) متن کے۔

یہ ترجمہ جو کہ دو جلدوں میں ہے پہلی جلد ۴۷۰ صفحات پر جبکہ دوسری جلد ۵۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

پہلی جلد کے آخر میں "پرائز بانڈ" کے عنوان سے چھ بابرکت صفحات رقم کیے گئے ہیں، جن سے آپ کو اس ترجمہ کے مکمل ہو کر شائع ہونے کی خوشی کا احساس ہوگا۔ آیئے ان کی خوشی میں حصہ دار بنتے ہیں: (ترجمہ)

"یہ کام میں نے ۱۴۱۱ ہجری کے پہلے روزے سے شروع کیا تھا۔ اور اندر سے یہ دعا مانگی تھی کہ گھڑا ابھر کر بغل میں چڑھانے سے پہلے ہی کہیں سانسوں کی ڈوری جواب نہ دے جائے۔ کیوں کہ ابا جی اور دادا جی کے سانس میری اس عمر کے اردگرد ہی پورے ہوئے تھے۔ اننے والے نے سن لی اور اگلا برس میں نے ترجمے کی طرف نظر کرنے میں گزار دیا۔ اور اسے اگلا برس کمپوزنگ کے چکروں میں گزر گیا بلکہ اس کاہلی اور سستی میں ایک بڑے ادارے سے کیے وعدے بھی پورے نہ ہو سکے۔ اور ترجمہ مکمل ہونے تک ادارے کا پروگرام بدل گیا۔ پر اس میں کوئی خدائی بھلائی تھی کہ مجھے کمپوزنگ کو دوبارہ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اور اب رب کو منظور ہوا تو ہو سکتا ہے یہ ترجمہ اسی ہجری سال میں شائع ہو جائے گا۔

اس سفر میں پڑ کے میں نے ہندوستان اور پاکستان کے قریب قریب سبھی اردو، فارسی اور انگریزی کے قابلِ ذکر ترجموں اور تفسیروں کو سامنے رکھا ہے۔ مولانا تاج محمود کے سندھی ترجمے۔ دلشاد کلانچوی کے پہلے پانچ سیپاروں کا سرائیکی ترجمہ اور مولی ہدایت اللہ کے پنجابی ترجمے سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

اس اقتباس سے اس ترجمے کے حوالے سے شریف کنجاہی صاحب کے ادم، خواہش اور جستجو کا اظہار ہوتا ہے۔ پہلی جلد میں سورہ فاتحہ سے سورہ طٰہٰ تک ترجمہ شامل ہے جبکہ کہ آخر میں "اشارے تے نتارے" کا باب ہے۔ جس میں قرآنِ حکیم کی آیات میں آنے والے حوالہ جات کی تفصیلات شامل ہیں۔ سورہ فاتحہ کا ترجمہ دیکھئے، کس قدر رواں، سلیس اور برمحل کیا گیا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد اللہ دی کرنی پھبدی جو رب سب دا

اوہ رحمان رحیم ہے

لیکھے والے دن دا مالک

تیری اسیں عبادت کریئے

تینوں ای بو رھن نوں کہنے

توں اسانوں سدھے راہے لائی رکھیں

راہ اوہناں دے تیرا فضل جنہاں دی جھولی

ناہ اوہناں دے توں ناراض جنہاں تے ہویوں یا ایدھر اودھر ہوئے۔۔"

کیا حسنِ توازن قائم رکھا ہے شریف کنجاہی صاحب نے اپنے ترجمہ میں اور وہ بات کھل کر اور واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے جس کا اظہار ڈاکٹر اسلم رانا نے اپنی بات میں کیا تھا۔ اس سے بڑھ کر وہ روانی اور شائستگی بھی شامل ہے جو اس عظیم کام کو کرنے کے لیے برقرار رکھنا چاہئے تھا۔

آیئے سورۂ یوسف اور سرۂ مریم میں سے ایک ایک ترجمہ دیکھئے:

"مصر اندر جس بندے مل لیا سی اس نوں زنال اپنی نوں اوس کہیا۔ جے ول طرح ای اس نوں رکھیں ہو سکدا اے نفع اسانوں ایہہ دے جاوے یا اسی اس نوں پتیا یئے۔"

انج اساں سی یوسف واسطے دنیا دے وچ تھاں بنائی

ساڈی ایہی مرضی ہے سی اس نوں خواب شناس بنایئے

بے شک اللہ جو کجھ چاہے کر کے رہندا چوکھے لوکاں نوں ناہ بھاویں پک اس بارے۔۔۔۔۔(۲۱)"

اور اب دیکھتے ہیں ایک آیت سورہ مریم سے:

اس کتابے اندر موسیٰ دی وی گل بلا توں۔ بے شک اوہ سی چنیا ہویا' اوہ رسول خدا دا نالے اوہ نبی سی اس دا۔

اوہنوں سد اساں ماری سی کوہ طور دے سجے لانبھوں۔ تے بھیت اس نوں دسّن واسطے کول بلایا۔

تے مڑ رحمت اپنی پاروں ہارون ورگا بھائی اس نوں دتا ہے سی نبی بنا کے

ذکر بن اسمٰعیلؑ (نبی) دا وی چھیڑ جائے وچ کتابے۔ قول دا اوہ بھی پکا ہے سی نبی رسول وی ہے سی۔

گھر بالاں نوں آہندا رہندا ہنوں نمازی تے اندر نوں ستھرا رکھو تے رب
اس تے راضی ہے سی۔
(اینج) ذکر ادریس (نبی) دا وی کر وچ کتاب ہے اوہ نبی سی سچ تے پہرہ
دینے والا۔
رتبہ اس (ایسے توں ای) اچا کیتا۔۔۔۔۔۔(۵۷)"
اور آخر میں سورہ طٰہٰ سے ایک خوبصورت ترجمے کی مثال:
ایہناں توں وی ودھ اچرج جاں اپنیاں تکواساں تینوں
جا ہن توں فرعونے کولے ٹُوا گاں اوہ تڑائی بیٹھا
(موسیٰ) عرض گزاری کیتی۔ ربا کریں کشادہ سینہ
نالے کریں مہم سکھلی
جیبھ میری بے اڑ چ بنائیں
غور کرن گل میری تے اوہ
گھر میرے چوں نائب اک بنادے میرا
توں ہارونؑ میرے بھائی نوں
اس دے پاروں لک میرا کھلوادے
میرے کم وچ اس نوں میرا انگی کردے
تاں جے چرچا تیرا کریئے رج کے
تے پڑھیئے تسبیحاں رج کے
بے شک توں اسانوں ویکھیں
رب کہیا اتے موسیٰ تیری کِدھی تھی گئی پوری
تیرے تے احسان اساں سی پہلاں وی اک واری کیتا
جد ماں تیری دے دل اندر گل پائی سی پانے
والی۔۔۔(۳۸)"
اس ترجمے کے حوالے سے کوئی بات بھی کرنے سے پہلے ایک آخری بات جناب شریف کنجاہی صاحب کی، جو وہ اس ترجمہ پڑھنے والوں سے کر رہے ہیں:

''میں پڑھنے والوں کا دھیان اس طرف ضرور کروانا چاہتا ہوں کہ اس کو
قرآنِ کریم کا عام معنوں میں ترجمہ نہ سمجھا جائے مفہوم ہی سمجھا جائے۔
میں نے ہر آیت کا مطلب پنجابی زبان اور بیان کے مزاج کے مطابق
کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس بات کو پنجابی لفظوں میں پنجابی جاننے
بولنے والوں تک پہنچانے کے خیال سے جو عربی لفظوں میں چودہ سو سال
پہلے عربی جاننے والی قوم کو میرے خیال میں پہنچائی گئی تھی۔''

یوں اس ترجمہ کے سلسلے میں لگتا ہے شریف کنجاہی نے وقف کر رکھا تھا اور یہ کام ایسا ہی تو ہے جو آپ سے ہر طرح کی توجہ، لگن، محنت اور محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ ورنہ اتنے اعلیٰ اور عظیم کام پر آغاز سے پہلے کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔

دوسری جلد جو ۵۳۷ صفحات پر مشتمل ہے اور جو ۱۹۹۷ء میں پہلی بار شائع ہو کر سامنے آئی اس میں سورۃ الانبیا سے سورۃ الناس تک کا پنجابی ترجمہ شامل ہے جس میں ۳۴ صفحات پر مشتمل اشارات بھی دیئے گئے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ معاصر عہد میں اتنا بڑا کام کسی اور مصنف اور مترجم کے یہاں نظر آتا تو یہ درست ہوگا کہ اس عہد میں ایسے عظیم کام کو کرنے کے لیے جتنے علم اور جس قدر دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے وہ سوائے شریف کنجاہی صاحب کے کسی کے پاس نہیں۔۔۔۔۔۔!! اور اب آخر میں ہم اس بابرکت باب کو سورۃ الرحمٰن کی کچھ آیات کے ترجمہ پر ختم کرتے ہیں:

''اوہ رحمٰن ایں، سکھلایا اوسے قرآن ایں
اوسے دی پیدائش ایہہ انسان ایں
سکھلایا اوسے نوں اوس بیان ایں
سورج تے چن اک حسابے رکھی جاندے
گھاہ بوٹے تے رُکھ تمامی اوسے اگے سیس نواندے
اچا کر کے کنڈے توں اسمان بنایا
ایس توازن دے وچ اپنے لچ نہ تلنا
خلقت واسطے دھرتی اوس وچھائی
پھل پھل اس دے وچ اگائے اُتے غلافل کھجیاں

دانے بھوئی' پھل خوشبوئی
رب اپنے دی کیہڑی کیہڑی دی نعمت دا انکار کرو گے۔"

------☆------

ساھواں دا ویزہ

یوں تو یہ شریف کنجاہی صاحب کی آپ بیتی ہے لیکن اس کے نام کے ساتھ جو علامتی نظام وضع کیا گیا ہے' نظر آ تا ہے۔ اس کے اندر شریف کنجاہی صاحب کی اس شاعرنہ طبع کو بہت عمل دخل ہے جو اکثر تخلیقات میں نمایاں ہوتا ہے۔ ۳۶۸ صفحات پر مشتمل اس آپ بیتی کو المیر ٹرسٹ' گجرات کے عارف میر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ شائع کیا۔ یہ کتاب پنجابی زبان وادب کی تارخ میں ان محدودے چند کتب میں سے ایک ہے جو پنجابی زبان میں لکھی گئی ہے' جو آپ بیتی ہے اور جو پنجابی میں اہم ترین اور سر فہرست نام جناب شریف کنجاہی صاحب نے تحریر کی ہے۔

اس آپ بیتی میں کنجاہی صاحب نے اپنے آبائی قصبے کنجاہ' کیمبل پور' راولپنڈی اور گجرات جیسے شہروں کو یاد کیا ہے تو دوسری طرف چوہدری فضل حسین' شاہین مفتی' لطیف گجراتی' انور مسعود' اکبر علی' پروفیسر حامد حسن سید' قربان طاہر' محمد بوٹا گجراتی جیسے گجرات کے دانشوروں' شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔

حفیظ جالندھری' حمید اختر' فیض احمد فیض' امرتا پریتم' شفقت تنویر مرزا' حفیظ تائب' درشن سنگھ آوارہ' شمس کاشمیری اور دیگر بے شمار قومی اور بین الاقوامی شہرت کی حامل ہستیوں کو بھی احاطہ تحریر میں لائے ہیں۔ پھر یہ آپ بیتی اس حوالے سے بھی انفرادیت کی حامل ہے کہ اس میں کنجاہی صاحب کی شاعرانہ' تخلیقی' تنقیدی اور تحقیقی بصیرت بھی جلوہ افروز نظر آتی ہے جو انہیں ایک بڑے

ادیب کے طور پر دنیائے ادب کے لوگوں سے متعارف کراتی ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے نام کا تعلق ہے تو اس کی انفرادی حیثیت بھی مسلمہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنی زندگی نامہ کو سانسوں کا ویزہ قرار دے کر اپنے آپ کو ملنے والی مدت اور مہلت میں سیر جہاں کا احوال تحریر کیا ہے وہ نئے لکھنے والوں کے لیے بے شمار راہیں کھولتا ہے۔ اور وہ تمام معاملات جو انہوں نے اپنی آپ بیتی کے صفحہ ۴۸ سے ۱۵۔ اپریل ۱۹۳۹ء۔ ۸ بجے شام کے زیر عنوان تحریر کرنا شروع کی ہے۔ دراصل ان کی زندگی اور انسان کے بارے میں روّیے کو کھول کر بیان کرتا ہے یہ نقطہ نظر:

> ''زندگی کس قدر عجیب ہے اور انسان اس سے بھی عجیب تر۔ واقعات کا سلسلہ کتنا لامتناہی اور پراسرار ہے۔ الموت کی اس جنت میں جسے دنیا کہتے ہیں کیا کچھ نہیں۔ اور جو کچھ ہے وہ کس انداز کا ہے۔ کتنے حسین تضاد اور کتنے تلخ اتفاقات بطن گیتی سے جنم لیتے اور مرتے رہتے ہیں۔ اور وہ اضداد اور اتفاقات ہمیں کہاں سے کہاں بہالے جاتے ہیں۔''

یقیناً یہی اضداد اور اتفاقات ہیں جو زندگی کو رنگ، نور اور روشنی عطا کرتے ہیں۔ یہ رنگ، نور اور روشنی زندگی کے بنیادی اور تخلیق کار روّیے اور رجحانات ہیں۔

اس آپ بیتی کے آخری دو صفحے جن کا عنوان ''یاداں دا پینڈا'' (یادوں کا سفر) ہے ۲۰۰۵۔۰۶۔۱۳ کو لکھا گیا۔ گویا یہ کتاب کم و بیش ۸۰ برس کی تاریخ اور حالات و واقعات کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ اس میں احباب کی تصاویر بھی ہیں جو ایک طرح سے دستاویزی یادداشت قرار دی جاسکتی ہیں۔

یہ کتاب لکھ کر شریف کنجاہی صاحب نے ہمارے ان بزرگ لکھنے والوں کو تحریک دی ہے کہ جن کے پاس پڑھنے والوں کے لیے، لکھنے کو بہت کچھ موجود ہے۔

اختتامیہ

انسان دوست اور انسانیت پسند شاعر ادیب شریف کنجاہی کا ایک فارسی شعر ہے:

تپید دل کہ دل است و نہ پارۂ سنگ است

زسنگ پارۂ تا دل ہزار فرسنگ است!

ان کی شخصیت مجھ سے' آپ سے' ہم سب سے متقاضی ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی کی اس بات کو کہ ''یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل'' کو پوری طرح منطبق کیا جائے کہ انہوں نے اپنے کام سے یہ ثابت کیا ہے اور انسان کا اس دنیا پر اگر کوئی جواز بنتا ہے تو وہ یہی ہے کہ وہ اس تسلسل کو زندگی کے اہم فرض کے طور پر نبھانے کے لیے کمر بستہ رہے۔ جس طرح کہ شریف کنجاہی صاحب رہے ہیں اور مجھے اپنی بات ختم کرنے کے لیے بھی جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کی چند سطروں کا سہارا لینا پڑتا ہے:

> ''صاحبو! میں ۴۲ء میں شریف صاحب کے نام اور ان کی شاعری سے آشنا ہوا تھا۔ پچھلے عرصے کا جائزہ لیتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں جو خوشگوار تاثر پہلے پہل ذہن میں ابھرا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محکم تر اور مستحکم ہوتا گیا ہے۔
>
> وقت بڑا ظالم ہے نجانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں وقت کی کارفرمائی سے رائے بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے لیکن شریف

صاحب کی شخصیت کے سحر کا دائرہ ہمیشہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ شریف صاحب کی موہنی شخصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت با کرامت رکھے اور ان کی دلنوازی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہے۔ آمین!''

اگرچہ اس قدر معتبر رائے کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت تو نہیں رہ جاتی۔ تاہم میں یہ کہنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کام کو پورا کرنا اور پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن ہوتا اگر واحد کنجاہی صاحب کی ذات ممد و معاون ثابت نہ ہوتی، کہ ان کا کام اتنے پہلوؤں اور اتنی سمتوں پھیلا ہوا تھا جس کا تجزیہ کرنا اور جس کو سمیٹنا امرِ مشکل تھا۔۔۔۔ پھر بھی جب میں نے یہ کام شروع کیا اور اس سلسلے میں جناب کنجاہی صاحب سے رابطہ کیا تو ۲۷ جنوری ۲۰۰۶ کو اس سلسلے میں ان کا پہلا خط ملا۔

''زاہد جی اجتاؤ! خط ملیا۔ تساں جس کتاب دا ذکر کیتا اے۔ اور تہانوں عارف میر ہوراں کولوں شاید مل سکے۔ میرے کول اوس دا کوئی نسخہ نہیں۔'' ایہہ کم اگے ارشد چھال ہوراں دے سپرد کیتا گیا سی تے راہ وچ ای رہ گیا۔ رب کرے جے تہاڈے ذریعے سر چڑھ جاوے۔''

دعاواں

شریف کنجاہی

شریف کنجاہی کی میراثِ قلم

۱۹۳۸ء ون دا بوٹا۔ پریت لڑی گورمکھی رسم الخط۔

۱۹۳۹ء آزادی کی راہیں۔ برٹرینڈ رسل کی کتاب Road to Freedom کا اردو ترجمہ

۱۹۴۱ء آزاد سماج۔ کروپاٹکن کی کتاب Conquest of Bred کے چند ابواب کا ہندی سے اردو ترجمہ۔

۱۹۵۳ء ہمارا جسم۔ گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ میں ملازمت کے وقت شائع ہوئی۔

۱۹۵۸ء جگراتے۔ جگتار سنگھ نے گورمکھی زبان میں انڈیا سے چھاپی۔

۱۹۶۰ء جھاتیاں۔ (اردو رسم الخط)

۱۹۶۵ء جگراتے۔ (اردو رسم الخط)

۱۹۷۷ء جاوید نامہ۔ منظوم پنجابی ترجمہ

۱۹۷۷ء علم الاقتصاد۔ منظوم پنجابی ترجمہ

۱۹۷۸ء کہے فرید۔ بابا فرید کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ

۱۹۸۰ء پنج سورہ۔ منظوم پنجابی ترجمہ

۱۹۸۰ء پنجابی شاعری کا انتخاب۔ منظوم اردو ترجمہ

۱۹۸۱ء مختصر پنجابی ڈکشنری

۱۹۸۳ء پنجابی شاعری کا انتخاب

۱۹۸۴ء شاہدولہ دریائی۔ حیات و تعلیمات

۱۹۸۶ء جگراتے۔ جھاتیاں (اشاعت مکرر)

۱۹۸۸ء نبی پاکؐ کے خطبے۔ ترجمہ نثر پنجابی

۱۹۹۱ء انگریزی کتاب۔ اسکینڈے نیویا کے لسانی رابطے (پنجابی)

۱۹۹۲ء ستارۂ سحری

۱۹۹۲ء ہیر وارث شاہ۔ ترجمہ اردو نثر۔

۱۹۹۲ء خطبات اقبال (ترجمہ اردو)

۱۹۹۴ء سورج، سوچ اور سائے (مجموعۂ کلام اردو)

۱۹۹۵ء مجنوں کا صحرا (مجموعہ اردو کلام)

۱۹۹۵ء اوڑک ہوندی لو۔ مجموعہ کلام پنجابی۔

۱۹۹۶ء ترجمہ گلشن راز جدید۔ محمود شبستری

۱۹۹۶ء قرآن مجید کا پنجابی ترجمہ۔ دو جلدیں

۱۹۹۷ء دو دِل۔ فارسی کلام

۱۹۹۹ء پاکستانی پنجابی شاعری

۲۰۰۰ء تاریخ گجرات۔ لفظوں کی عینک (تحقیق)

۲۰۰۴ء رویہ۔۔۔۔ اک جہات (تحقیق)

۲۰۰۵ء (جپ جی۔۔۔۔ اک جہات

۲۰۰۵ء ساہواں داویزہ۔ آپ بیتی

اعزازات

۱۹۸۰ء نشان گجرات (ادبی ایوارڈ کونسل۔ گجرات)
۱۹۸۳ء تمغۂ امتیاز (حکومت پاکستان۔ شعبہ پنجابی ادب۔
۲۰۰۰ء پرائڈ آف پرفارمنس۔حکومت پاکستان۔ (شعبہ پنجابی ادب)
۲۰۰۴ء رسم تاجپوشی از بزم غنیمت کنجاہی۔ گجرات

مسافرت سیاحت

لندن۔ سعودی عرب

۱۹۸۰ء میں لندن میں پنجابی کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے' وہاں سے ہی والدہ صاحبہ کی خواہش پر ان کی جانب سے حج بدل کرنے کے لئے سعودی عرب کا ویزہ لگوایا اور عمرہ ادا کیا۔ قبل ازیں لندن میں کمیونزم کے بانی کارل مارکس کی زیارت پر جانے کا اتفاق ہوا جہاں اس کے ماننے والوں کی جانب سے قبر پر'' نے چراغ نے گلے'' کا سماں دیکھ کر بڑے پریشان ہوئے لیکن اس کے مقابلے میں مکہ اور مدینہ شریف اللہ تعالیٰ کے ماننے اور نبی پاک ﷺ کے پیروکاروں کا حیرت زا اور نہ ختم ہونے والا ہجوم دیکھ کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اس Contrast کا موازنہ بالاخر انکار سے اقرار کی صورت میں نکلا۔ اس موقع پر انہوں نے زندگی کی پہلی نعت روضہ رسول ﷺ پر بیٹھ کر لکھی اور پھر آئندہ شاعری سے بھی ریٹائرمنٹ کا فیصلہ کیا جس پر آج تک قائم ہیں۔

۱۹۸۵ء ناروے۔ مطالعاتی دورہ

۱۹۸۷ء ناروے۔ مطالعاتی دورہ

شریف کنجاھی۔عکسِ زندگی

خاندانی کوائف

نام	محمد شریف خان
والد کا نام	مولوی غلام محی الدین
قلمی نام	شریف کنجاہی
والدہ کا نام	فضل نور
تاریخ پیدائش	بمطابق ۱۴ رمضان ۱۳۳۳ھ ۱۳ جولائی ۱۹۱۱ء
بیٹی کا نام	خالدہ یوسف
ہمشیرگان	حمیدہ بیگم/ سکینہ بی بی والدہ ڈاکٹر محمود الحسن کنجاہی
شادی	نذر بیگم سے ۱۹۳۳ء میں ہوئی
	(۱۹۸۱ء مرحومہ)
رہائش	۶۱ مرغزار کالونی (ٹیلیفون رہائش ۶۰۵۶۶۸) شہر گجرات

تعلیمی حوالے

۱۹۳۳ء	ایف گورنمنٹ انٹ کالج گجرات موجودہ گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج گجرات
۱۹۴۳ء	منشی فاضل (بی اے)
۱۹۴۴ء	بی ٹی (سنٹرل ٹریننگ کالج (لاہور
۱۹۵۴ء	ایم اے (اردو)
۱۹۵۶ء	ایم اے (فارسی)

روزگار شریف

۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۹ء — اسلامیہ ہائی سکول کنجاہ بطور ایٹیئر انگلش ٹیچر

۱۹۵۱ء — اسلامیہ ہائی سکول شادیوال

۱۹۵۲ء — پبلک ہائی سکول کنجاہ

۱۹۵۳ء — گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ

۱۹۵۷ء — گورنمنٹ کالج سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی لیکچرار (اردو (عارضی تقرری)

۱۹۵۸ء — گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب

۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۲ء — گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) لیکچرار

۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۷ء — گورنمنٹ کالج گوجرخان (لیکچرار)

۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۲ء — گورنمنٹ کالج جہلم (لیکچرار (فارسی)

(نوٹ) پبلک سروس کمیشن میں اردو اور فارسی میں منتخب ہوئے۔ فارسی پڑھانے کو ترجیح دی۔ اس دوران چند ماہ لالہ موسیٰ اور تلہ گنگ میں بھی پڑھایا۔

۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۰ء — گورنمنٹ کالج جہلم (لیکچرار فارسی) جہلم سے ریٹائرمنٹ کے بعد یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ پنجابی میں مامور ہوئے اور ۱۹۸۰ء تک پڑھایا۔

۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۸ء — مقتدرہ قومی زبان کے ماہنامہ اردو سے منسلک ہوئے اور ۱۹۸۸ء میں واپس گجرات آ کر نجی طور پر تحریر و تالیف میں لگ گئے۔

حواشی

۱۔ آنگن میں ستارے‘ ڈاکٹر اسلم فرخی‘ شہرزاد کراچی

۲۔ اوڑک ہوندی لو‘ شریف کنجاہی‘ پولیمر پبلشرز اردو بازار لاہور ۱۹۹۵ء

۳۔ پاکستانی پنجابی شاعری‘ شریف کنجاہی‘ محکمہ اطلاعات وثقافت وامور نوجوانان حکومت پنجاب‘ لاہور‘ ۱۹۹۹ء

۴۔ پنجابی ادب دی کہانی‘ عبدالغفور قریشی‘ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ‘ لاہور

۵۔ پنجابی ادب دی مختصر تاریخ‘ قریشی احمد حسین قلعداری‘ عزیز بک ڈپو اردو بازار لاہور

۶۔ پنج سورہ‘ شریف کنجاہی‘ منظوم پنجابی ترجمہ۔ س۔ن

۷۔ پرکھ پڑچول‘ عارف عبدالمتین‘ ٹیکنیکل پبلشرز اردو بازار لاہور ۱۹۹۳ء

۸۔ جاوید نامہ‘ شریف کنجاہی منظوم پنجابی ترجمہ‘ مجلس ترقی ادب‘ کلب روڈ لاہور ۱۹۷۷ء

۹۔ جپ جی۔ اک جھات‘ شریف کنجاہی‘ المیر ٹرسٹ لائبریری‘ گجرات‘ ۲۰۰۵ء

۱۰۔ جگراتے‘ شریف کنجاہی‘ عزیز بک ڈپو اردو بازار لاہور ۱۹۸۶ء

۱۱۔ جھاتیاں‘ شریف کنجاہی‘ الجدید پبلشرز لاہور‘ س ن

۱۲۔ جھاتیاں دا تنقیدی تے تحلیقی جائزہ (مقالہ ایم اے اردو) غزالہ رفیق ۱۹۹۰ء

۱۳۔ ’’رزم نو‘‘ ماہنامہ‘ جلد ۲ شمارہ ۹۔۸‘ گجرات۔ س ن

۱۴۔ رگ وید‘ شریف کنجاہی۔ المیر ٹرسٹ لائبریری گجرات ۲۰۰۴ء

۱۵۔ رنگ سنگ‘ ڈاکٹر اسلم رانا‘ عزیز بک ڈپو اردو بازار لاہور‘ س۔ن

۱۶۔ ’’زجاج‘‘ ماہنامہ فروری۔ مارچ۔ ۱۹۹۱ء گجرات

۱۷۔ ساہواں دا ویزہ (آپ بیتی) شریف کنجاہی‘ المیر ٹرسٹ لائبریری ۲۰۰۵ء

۱۸۔ سجرے پھل‘ مرتب انیس ناگی‘ پنجابی مجلس‘ لاہور اپریل ۱۹۵۹ء

۱۹۔ آ شریف کنجاہی کی ادبی خدمات' (تحقیقی مقالہ۔ ایم اے اردو) شازیہ خورشید ۱۹۸۹ء

۲۰۔ شریف کنجاہی کی پرورش لوح و قلم۔ پروفیسر حامد حسن سید' المیر ٹرسٹ لائبریری' گجرات۔

۲۱۔ قرآن مجید دا پنجابی ترجمہ (دو جلداں) شریف کنجاہی' سنگت پبلشرز' لوئر مال' لاہور ۹۶۔۱۹۹۷ء

۲۲۔ لہراں' شریف کنجاہی نمبر' ماہنامہ' جلد ۳۰ شمارہ بارہ دسمبر ۱۹۹۳ء

۲۳۔ ملاقاتیں' انتظار حسین' مکتبہ عالیہ' اردو بازار' لاہور ۱۹۸۸ء

۲۴۔ نویں نظم' سرفراز حسین قاضی' عزیز بک ڈپو' اردو بازار لاہور' س ن

۲۵۔ ویرتوں کنجاہ دا ایں' پروفیسر خالد ہمایوں' سنگت پبلشرز' لوئر مال لاہور' ۱۹۹۸ء